تاریخ عالم ہماری ایک ہزار سالہ تاریخ کی مثال پیش نہیں کر سکتی: غامدی

شہادت حضرت حسینؓ سے متعلق: تمام واقعات افسانہ: غامدی

اصل میں حضرت حسینؓ کو ان کے ساتھ آنے والے قافلے نے قتل کیا

[غامدی کا انٹرویو، اسلامی تہذیب بمقابلہ مغربی تہذیب، ص ۱۴ تا ۶۷، دار التذکیر لاہور]

مغرب کے غلبے کے ایک سو سال کی تاریخ مسلم تاریخ کے سامنے بے وقعت ہے: غامدی

غامدی: رواداری کی قدریں تو ہماری ایک ہزار سال کی تاریخ میں بہت شاندار تھیں۔ مثلاً مسلمانوں نے اپنی ایک ہزار سال کی حکومت کے دوران تمام اقلیتوں کو مکمل مذہبی آزادی دی تھی کہ وہ اپنے نکاح، طلاق اور دوسرے معاملات اپنے مذہبی طریقے کے مطابق کریں۔ اپنی عدالتیں بنائیں اور اپنے فیصلے خود اپنے مذہب کی روشنی میں کریں۔ یہ آزادی آج مجھے امریکہ میں بھی حاصل نہیں ہے۔ رواداری کی یہ انتہا ہے جو مسلمانوں نے اپنی تاریخ میں پیش کی، اس کی کوئی مثال اس وقت دنیا میں نہیں ہے۔ ہم آج بھی نکاح اور طلاق جیسے اپنے پرسنل قانون کے مطابق برطانیہ، امریکہ اور جرمنی میں بھی عمل نہیں کر سکتے۔ یہ ایک حاضر و موجود چیز ہے جس سے آپ اس وجہ سے مرعوب ہوتے ہیں کہ آپ اپنا ماضی بھی بھول جاتے ہیں۔ یہ ہم مسلمان ہیں، جن کے غلبے کی تاریخ پوری ایک ہزار سال تک ہے اور ان کے غلبے کی تاریخ ابھی سو سال کی بھی نہیں ہوئی اور اس حصے کی ایک ہزار سالہ تاریخ میں ہم نے غیر مسلم اقلیتوں کے معاملے میں جو اقدار قائم کیں، جو رویہ اختیار کیا اس کے اوپر ذرا انگلی رکھ کر بتائیے کیا آج آپ کی دنیا اس کے قریب بھی پہنچی ہے؟

سوال: جذبات سے ہٹ کر اگر جائزہ لیں تو ہمارے اس ایک ہزار سالہ دور غلبہ کے دوران سسٹم کے لحاظ سے ایک سو ایک خرابیاں رہی ہیں؟

عالم اسلام میں تنقید کی آزادی پوری شان کے ساتھ موجود تھی: غامدی

غامدی: آپ ذرا ان خرابیوں کی نشاندہی کریں۔

سوال: سب سے پہلی بات تو یہ کہ ہمارے ہاں جمہوری قدریں ہی نہیں رہی ہیں؟

جمہوری قدروں سے آپ کی کیا مراد ہے۔ کیا سوچنے، بولنے تنقید کرنے کی آزادی نہیں تھی بلکہ یہ تمام چیزیں پوری شان کے ساتھ موجود رہی ہیں۔

سوال: کیا جابر قسم کی بادشاہتیں نہیں تھیں؟

غامدی: بادشاہت ایک الگ چیز ہے اور جمہوری قدریں ایک الگ چیز ہیں۔ حکومت تبدیل کرنے کا عوام کو حق دیا جائے، جمہوریت صرف اس چیز کا نام نہیں ہے۔ جمہوری اقدار کا تو مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو سوچنے کی آزادی ہو۔ اختلافات کرنے کی آزادی ہو اور اپنی فکر پیش کرنے کی آزادی ہو۔ کھلا مناظرہ کرنے کی آزادی ہو۔ اپنے مذہب پر قائم رہنے اور اسے پیش کرنے کی آزادی ہو جس امت کی روایت یہ ہو کہ اس کے ابتدائی دور میں خوارج جیسا مسلح گروہ پیدا ہوا جو انارکسٹ تھے جو گلیوں اور بازاروں میں دہشت گردی کرتے پھرتے ہیں اور ان کا حکمران ان سے یہ کہہ رہا ہے کہ جب تک تمہارا جرم ثابت نہیں ہو جائے گا میں تمہارے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتا۔ میں نہیں جانتا آزادی اور حریت کی آخری انتہا اس سے آگے کون سی ہو سکتی ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ میں آزادی و حریت سے انحراف کی اکا دکا مثالیں ملتی ہیں: غامدی

سوال: کیا آپ بتانا پسند فرمائیں گے کہ خود مسلمانوں میں یہ دور کتنی دیر کے لیے قائم رہ سکا؟

غامدی: میں تو کہتا ہوں کہ ایک ہزار سال تک مسلمانوں کی یہ روایت رہی اور اس سے انحراف کی اکا دکا مثالیں ہی ملتی ہیں اور اگر کبھی یہ انحراف ہوا ہے تو مسلمان امت کے اجتماعی ضمیر نے اور اس کے علماء اور دانشوروں نے اس انحراف کو خود توڑ کر رکھ دیا ہے۔

سوال: اس ایک ہزار سالہ دور میں پچیس تیس سالوں کو چھوڑ کر آپ بتائیں کہ آپ کی حکومتیں کس طرح تبدیل ہوتی رہیں؟

مسلمانوں کی تاریخ عظیم جمہوری اقدار کی تاریخ ہے: غامدی

غامدی: یہ ایک چیز ہے، حکومت قائم کرنے کے معاملے میں اسلام نے ہمیں جو اصول دیا تھا کہ یہ مسلمانوں کی رائے سے ختم ہونی چاہیے اور رائے سے قائم ہونی چاہیے۔ اس کو تو ہم بلاشبہ پامال کر بیٹھے ہیں لیکن اس پر یہ کہنا کہ ہم جمہوری قدریں ختم کر بیٹھے غلط ہے۔ انسانیت کا احترام، لوگوں کے لیے ان کی ضروریات کی پاسداری، ان کو ان کی دہلیز پر انصاف پہنچانے کا اہتمام اور ان کے لیے بالخصوص مذہبی آزادی۔ میں تو آپ سے عرض کر رہا ہوں، آپ اندازہ کریں کہ عباسیوں کے دور میں یہودیوں کے محلّوں میں شراب بنائی جاتی تھی۔ عیسائیوں کے محلّوں میں سور پالے جاتے تھے، کسی حکومت نے کبھی ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ میں خلافت راشدہ کی بات نہیں کر رہا ہوں، بلکہ عباسی دور کے ادب میں ''شرب الیہود'' کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی، ان مسلمانوں کے لیے جو وہاں جا کر شراب پیتے تھے، لیکن ان پر پابندی لگانے کے لیے اسلامی حکومت تیار نہیں تھی۔ عدالتیں ہمیشہ غیر مسلموں کی اپنی قائم رہیں اور وہ ہماری ریاستوں میں پوری آزادی کے ساتھ اپنے دین کے مطابق کام کرتی رہیں۔

جمہوریت، اس چیز کو بھی ہمیں نے سب سے پہلے دنیا میں پیش کیا۔ دنیا میں سب سے پہلے ایک منظم سطح پر یہ اصول پیش کرنا کہ لوگوں کی رائے سے حکومت قائم ہوگی۔ یہ پیش کرنے والے ہم ہی تھے۔

سوال: لیکن اس پر کتنا عمل ہوا؟

حضرت معاویہؓ کی حکومت سے زیادہ آزادی اور حریت کی علمبردار حکومت نسل انسانی نے آج تک نہیں دیکھی: غامدی

ہماری ہزار سالہ تاریخ تاریک نہیں عظیم الشان تاریخ ہے

ہماری تاریخ کے سامنے آج کی بڑی بڑی مغربی حکومتیں ماند نظر آتی ہیں

غامدی: میں آپ سے عرض کر رہا ہوں کہ یہ ایک چیز اگر پامال ہوگئی تو آپ ہر چیز پامال کر بیٹھے جیسے میں نے آپ کے ساتھ انصاف کی بات کی ہے۔ آپ بھی انصاف سے بات کیجیے۔ اس زمانے میں مغرب نے ہمیں ایک بڑی اچھی چیز دی جو دراصل ہماری ہی متاع تھی۔ انھوں نے ہمیں لوٹا دی لیکن یہ کہ ہماری ہزار سال کی تاریخ کوئی تاریک تاریخ ہے؟ میں کہتا ہوں کہ اس کی روشنی کے مقابلے میں موجودزمانے کی بڑی سے بڑی حکومتیں ماند نظر آتی ہیں۔

حضرت امیر معاویہؓ کی حکومت سے زیادہ بڑی رفاہی حکومت، زیادہ بڑی آزادی اور حریت کی علمبردار حکومت، میرے علم اور مطالعہ کی حد تک نسل انسانی آج تک نہیں دیکھ سکی۔

سوال: وہ جنھوں نے ابوذر غفاریؓ کو تنقید کرنے پر اور بیت المال کو خدا کے بجائے عوام کا سرمایہ کہنے پر کہا تھا کہ شہری آبادیوں سے نکل جاؤ؟

حضرت معاویہؓ کے حلم پر عربی ادب میں بے شمار چیزیں کلاسیک بن گئیں: غامدی

غامدی: یہ ایک مکروہ افسانہ ہے جو تاریخ کے نام پر تھوپ دیا گیا ہے۔ اس طرح کے افسانے یہاں خاص پروپیگنڈے کے ذریعے عام کر دیے گئے ہیں جس شخص کا معاملہ یہ ہو کہ وہ اپنی بوڑھی ماں کے رشتے کی بات کرنے والے آدمی کو تخت پر بیٹھے ہوئے یہ جواب دیتا ہو کہ ہمارے بزرگوں کے ہاں جو روایات ہیں، ان کے تحت میں ان سے بات کر کے دیکھوں گا ہو سکتا ہے وہ مان جائیں، جس شخص کا عالم یہ ہو کہ وہ لوگوں کو عطیات دیتا ہو اور ایک آدمی جواب میں یہ کہتا ہو کہ معاویہ نے مجھے جتنا دی عطیہ دیا ہے اگر اس سے میری ملاقات ہوئی تو میں اس کی چٹیا پر تھپڑ ماروں گا، اور وہ اس کو بلا کر یہ کہتا ہو کہ چچا آپ مجھ سے بڑے ہیں، میں اپنی پگڑی اتارتا ہوں آپ تھپڑ مار لیں جس کے حلم پر عربی ادب میں بے شمار چیزیں کلاسیک بن گئی ہیں۔

سوال: ہم نے تو پڑھا ہے کہ انھوں نے بڑے بڑے جلیل القدر انسانوں کو.....؟

دنیا کی شاندار ترین فلاحی حکومت بنوامیہ کی تھی آج بھی کوئی اس کا مقابلہ نہیں: غامدی

بنوعباس کے ملوک خلفائے راشدین کے طرز عمل سے قریب تر تھے:

غامدی: بنوامیہ کے خلاف ہمارے ہاں ایک مکروہ پروپیگنڈہ کیا گیا ہے، آپ اس سے متاثر ہیں۔ آپ نے تاریخ کو اندر اتر کر نہیں پڑھا، اگر آپ تاریخ کو تحقیقی طور پر پڑھیں گے تو آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ بنوامیہ کی حکومت میں ایسے ایسے جلیل القدر لوگ پیدا ہوئے ہیں کہ آپ تصور نہیں کر سکتے اور جو رفاہی حکومت انھوں نے قائم کی ابھی تک، ہاں ابھی تک، دنیا میں کوئی حکومت اس کے مماثل نہیں ہو سکی۔ ہوا یہ ہے کہ آدمی بعض اوقات ایک جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ ایک چیز پامال ہوگئی ہے، اس کا ہمیں اعتراف کرنا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں کی رائے سے جو حکومت بننے اور ٹوٹنے کا عمل تھا، اس کو وہ ایک انسٹی ٹیوشن میں نہیں بدل سکے اور یہ چیز ختم ہوگئی۔ اس کے بعد ہم نے ساری کالک اٹھا کر ان کے منہ پر مل دی۔ آپ میرے پاس بیٹھ جائیں میں آپ کو تاریخ کے ناقابل تردید شواہد سے یہ بات ثابت کر دوں گا کہ لوگوں کی فلاح کا سب سے زیادہ خیال رکھنے والی حکومت

بنوامیہ نے قائم کی تھی۔اس کے بعد بنوعباس نے اس کی اعلیٰ روایات کو قائم رکھا۔بنوعباس کے ہاں ایسے ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ان میں اور خلفائے راشدین میں بس قدرے فاصلہ ہے۔

سوال: لیکن آپ یہ پہلو بھی تو دیکھیں کہ اپنی اپوزیشن کے ساتھ انھوں نے کیا سلوک کیا؟

ہماری ہزار سالہ تاریخ میں صرف پانچ دس واقعات افسوسناک ہیں: غامدی

غامدی: اپوزیشن کے ساتھ انھوں نے کیا سلوک کیا، جن لوگوں نے ان کے خلاف تنقید کی وہ اسی طرح رہے، جن لوگوں نے ان کے خلاف اقدامات کیے ان کے خلاف انھوں نے کارروائی ضرور کی بالخصوص بغاوت کے ایک اقدام کے جواب میں انھوں نے جو کارروائی کی اس کے بدلے میں آج تک انھیں گالیاں پڑ رہی ہیں۔سوال یہ ہے کہ اگر آج کے دور میں بھی کسی علاقے میں بغاوت ہو جائے تو آپ کی موجودہ حکومت کیا کرے گی۔مثال کے طور پر آج اگر کراچی میں ایم کیو ایم یا لاہور میں جماعت اسلامی بغاوت کر دے تو آپ کی موجودہ حکومت کیا کرے گی؟ باقی تنقید کرنے والی بات آپ کریں، کس نے تنقید کی ہے اور اسے سزا ملی ہے؟ امیر معاویہ کے سامنے کھڑے ہو کر ان پر شدید ترین تنقید کی گئی، بنوعباس کے سامنے کھڑے ہو کر ہمارے فقہاء وعلماء نے شدید ترین تنقیدیں کیں۔اگر ہزار سال کی تاریخ میں پانچ دس ایسے واقعات ہو گئے تو آپ سب کچھ ختم کر رہے ہیں۔

بنوامیہ کی تاریخ روشنی ہی روشنی کی تاریخ ہے: غامدی

اسلامی تاریخ کی مثال دنیا کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی:

سوال: لیکن آپ دوسری نوعیت کے واقعات کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کر رہے ہیں۔

غامدی: میں ایک محقق آدمی ہوں، میں نے تاریخ کو اس کی اصل روشنی میں پڑھا ہے بنوامیہ کے خلاف جو فرد جرم ہمارے ہاں عام کی گئی ہے اور تیسرے درجے کے لوگوں نے اس کو پھیلانے کی کوشش کی ہے وہ تحقیق کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔جب تحقیق کر کے اس زمانے کی معاصر تاریخوں کو پڑھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ روشنی ہی روشنی ہے۔جس میں چند دھبے ہیں جن کو اٹھا کر بہت بڑا بنا دیا گیا ہے اور مسلمانوں کی موجودہ نسل کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کے اندر تحقیق کا ذوق نہیں ہے۔سنی سنائی باتیں بیان کر دیتی ہے اور جو پراپیگنڈہ کر دیا جائے اس سے متاثر ہوتی ہے، اس کے ہاں تحقیق کو شجر ممنوعہ سمجھا گیا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسی طرح کی باتیں بیان کر دیتی ہے، قبول کر لیتی ہے اور شرم کے مارے سر جھکائے رکھتی ہے۔میں یہ کہتا ہوں کہ آپ کے درمیان رواداری، ایک دوسرے کا احترام، اختلاف رائے کو قائم رکھنے اور قائم رہنے دینے کے مواقع کی اتنی شاندار تاریخ ہے کہ جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

[انٹرویو کرنے والے کا اشارہ نواسہ رسالت مآبؐ حضرت حسینؓ کے اقدام خروج کی طرف ہے، ساحل]

سوال: بات یہ ہے کہ ایک واقعہ میں اگر کوئی مسلح ہو کر آتا ہے.....؟

غامدی: میں کہتا ہوں کہ ایسے لاکھوں واقعات ہیں کہ لوگوں نے اس معاملے میں انتہا کر دی لیکن حکومت نے ایسے عفو و درگزر سے کام لیا جس کی مثال نہیں ملتی۔

سوال: اگر کوئی کہتا ہے کہ مجھے واپس چلے جانے دیں یا حکمران سے مل کر بات کرنے دیں اور پھر آخر میں ملک بدر کر کے چلے جانے دیں یہ انتہا ہے، پسپائی کی اور پرامن رہنے کی اس پر بھی حکومت اگر ایسا بڑا جبر کرے تو یہ جمہوری یا اخلاقی اقدار کی کون

سی قسم ہے؟ [انٹرویو کرنے والا شہادت حضرت حسینؓ نواسہ رسالت مآبؐ کے پس منظر میں سوال پوچھ رہا ہے، ساحل]

حضرت حسینؓ کی شہادت کا ذمہ داران کے ساتھ کے قافلے کے لوگ تھے: غامدی

غامدی: سوال یہ ہے کہ ایک آدمی بغاوت کر کے آ گیا ہے، [حضرت حسینؓ کے لیے ایسے توہین آمیز الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، ساحل] اب وہ سرنڈر کر دے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ اس وقت کے گورنر کو اس معاملے میں عقلمندی سے کام لینا چاہیے تھا اور اس حادثے کو ہونے سے روکنا چاہیے تھا، لیکن اب تو نئی تحقیقات یہ بتا رہی ہیں کہ اس میں سرے سے حکومت کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا بلکہ ان کے ساتھ کے قافلے کے لوگوں نے ان پر حملہ کر دیا تھا جسے بچاتے بچاتے یہ سارا حادثہ ہو گیا۔

سوال: آپ کی بیان کردہ یہ نئی تحقیق کیا ایک نیا پروپیگنڈہ نہیں ہے جو خاص مقاصد کے تحت گھڑا گیا ہے اور جس سے پوری امت صدیوں تک بے خبر رہی؟

غامدی: اگر میں اس کے جواب میں یہ کہوں کہ جو کچھ اب تک سنا کہا گیا ہے وہ لوگوں کا مکروہ پروپیگنڈہ ہے جو تحقیق کے کسی معیار پر پورا نہیں اترتا جس میں افسانہ تراشی کی گئی ہے۔ [غامدی صاحب واقعہ کربلا اور شہادت حسینؓ سے متعلق تمام تاریخی واقعات اور بیانات کو ٹھوس دلائل اور تاریخی شہادتوں کے بغیر افسانوی پروپیگنڈہ قرار دے رہے ہیں، ساحل]

سوال: افسانہ تراشی سے تو کوئی انکار نہیں لیکن.....؟

کربلا اور شہادت حسینؓ کے واقعات سو فیصد افسانہ تراشی ہیں:

میں کہتا ہوں کہ اس میں سو فیصد افسانہ تراشی ہے۔ اس واقعہ کو جس طرح بیان کیا جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ بیان کرنے والے وہیں خیمے کے اندر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے پاس ٹیپ ریکارڈ بھی تھے۔ اس سے اندازہ لگا لیں کہ جو کچھ دوسرے لوگ بتا رہے ہیں وہ اتنی زیادہ افسانہ نگاری کے درمیان میں موجود رہ گیا ہے جس کے بارے میں آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ جدید تحقیقات کیا ہیں۔ پروپیگنڈے کے اتنے ملبے کے نیچے وہ موجود ہیں۔

سوال: میں تو اسے بھی ویسی ہی دوسری انتہا سمجھتا ہوں، جیسی انتہا افسانوی قصے گھڑنے والوں کی تھی؟

ایک ہزار سال تک مسلم خلافت شاندار تھی:

رواداری، حریت آزادی کا سبق مغرب کو اسلام نے سکھایا:

غامدی: یہ ٹھیک ہے، اعتدال پر آ جایے، یہ کہ جو ایک ہزار سال تک ہماری حکومت تھی، اس میں غلطیاں اور کوتاہیاں بھی تھیں، جیسی موجودہ حکومت میں بھی ہیں، لیکن ان کے محاسن پر پروپیگنڈے نے ایسا پردہ ڈال دیا ہے جس سے آپ جیسے لوگوں کا نقطۂ نظر اعتدال پر نہیں رہا۔ اعتدال کا نقطۂ نظر یہ ہے جو میں نے ابھی آپ کے سامنے بیان کیا ہے کہ یہ نہایت شاندار حکومتیں تھیں، اس کے ساتھ ان سے بعض بڑی غلطیاں بھی ہوئیں اور بعض شرمناک واقعات بھی ہوئے۔ جو چیز قلیل ہے اسے کثیر نہ بنایئے، یہ مت سمجھیے کہ رواداری کا سبق دنیا کو مغرب نے سکھایا آزادی اور حریت سے دنیا کو مغرب نے روشناس کرایا ہے۔

سوال: میرا موقف واضح ہے کہ ان اقدار کو آج جس طرح مغرب پیش کر رہا ہے اس طرح مسلمان نہیں کر رہے؟

مسلمانوں نے ہزار برس کی تاریخ میں جو کیا مغرب اسکو ابھی تک چھو بھی نہ سکا: غامدی

غامدی: نہیں کر رہے، سے مجھے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مسلمانوں نے ہزار برس تک جو کچھ کیا مغرب اس کو ابھی تک چھو

بھی نہیں سکا۔ میں نے ابھی آپ کو بتایا کہ میں اپنے طریقے کے مطابق کسی مغربی ملک میں اپنے پرسنل لاء پر عمل نہیں کرسکتا۔ میں نکاح نہیں کرسکتا، طلاق نہیں دے سکتا، مجھے مغربی سوسائٹی کے قانون اور روایات کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔لیکن مسلمانوں کی پوری تاریخ میں نہ صرف غیر مسلموں کو مکمل آزادی تھی اور حد یہ ہے کہ پرسنل لاء تک کے بارے میں مسلمانوں نے یہ روایت قائم کر ڈالی کہ یہ لوگ اپنی بستیوں میں پبلک لاء سے متعلق بھی اپنے قانون کے مطابق فیصلے کرواسکتے تھے۔''

ہماری ایک ہزار سالہ حکومتوں کا سنہری کردار:

دانشور کیا کہتے ہیں آپ اس کو چھوڑیے آپ یہ دیکھیے کہ ان کا قانون کیا کہتا ہے ہم نے جب دنیا کے اندر بین الاقوامی قوانین پیش کیے آپ مجھے وہاں کوئی اس قسم کی بات دکھایے۔قرآن نے اعلان کیا کہ دیکھو تمہیں کسی قسم کی دشمنی بھی اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ تم خلاف عدل بات کرنے لگو۔''عدل کرو یہ تقویٰ کے قریب ہے''۔ یہ ہے ہمارا بین الاقوامی قانون، جو نہ صرف قرآن میں ثبت ہوگیا بلکہ ایک ہزار سال تک مسلمانوں نے بالعموم اس کی پابندی کی۔ بین الاقوامی معاملات میں بھی اگر کسی موقع پر ہماری حکومت سے فروگزاشت ہوئی تو ہمارا علم اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا اور علم و دانش کے سامنے حکومتوں کو سرنڈر کرنا پڑا۔اس طرح کی بھی آپ کو سینکڑوں مثالیں دے سکتا ہوں۔

سوال: سادہ دور کی باتوں اور جدید دور کے پیچیدہ وسیع تقاضوں میں فرق ہے۔ ارتقائے شعور انسانی کے ساتھ اور دیگر اقوام عالم کا ذمہ دارانہ رویہ بڑھنے کے ساتھ ایسی ناروا چیزیں بالآخر ختم ہوجائیں گی۔

غامدی: کیا ختم ہوجائیں گی ہم نے تو بالفعل اپنے ہزار سالہ دور میں ختم کیں جب کہ آپ کہتے ہیں دنیا کو حریت اور آزادی جیسی اقدار سے مغرب نے نوازا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی سلطنت جو پورے مغرب سے بڑی تھی اس کا خلیفہ اپنے منبر پر کھڑے ہوئے کہہ رہا تھا کہ ''جن بچوں کو ان کی ماؤں نے آزاد جنا، تم نے انھیں غلام کب سے بنالیا''۔

سوال: آپ حال کا مقابلہ ماضی سے کررہے ہیں۔ میں کہتا ہوں آپ حال کا مقابلہ حال سے اور ماضی کا مقابلہ ماضی سے کریں۔تصورات کے مقابلے میں تصورات لائیں اور عمل کے بالمقابل عمل پیش فرمائیں؟

غامدی: مسلمان اس وقت مغرب سے زیادہ پست ہیں۔ان کے ہاں اپنے دین کا بھی شعور نہیں ہے۔مغرب کی اچھی اقدار کو اپنانے کا بھی انھیں کوئی شعور نہیں ہے۔اگر آپ مسلمانوں اور مغرب کا تقابل کرنا چاہیں تو مغرب انتہائی بلندی پر کھڑا ہے اور اگر آپ مغربی تہذیب کی اقدار کا مطالعہ کررہے ہیں تو اس کے جواب میں مجھے اسلام پیش کرنا پڑے گا۔ میں اس میں کسی عملی چیز کی مثال نہیں دوں گا کیونکہ عملی میدان میں مسلمان اس وقت پستی کا شکار ہیں۔مغرب نے صرف دو چیزوں کو زندہ کیا ہے ایک یہ کہ پر امن طریقے کے ساتھ عوام کی رائے سے حکومتیں تبدیل ہوں اور دوسرے انھوں نے مذہبی Prosecution کا خاتمہ کیا اور ایک اچھا اجتماعی نظام دنیا کو دکھایا۔اپنی سوسائٹی کے اندر فلاحی ریاستیں قائم کیں۔[کیمبرج یونیورسٹی سے شائع ہونے والی مائیکل مین کی کتاب The Dark Side of Democracy کے اعداد و شمار اگر غامدی صاحب پڑھ لیں تو اپنے اس جاہلانہ موقف سے دستبردار ہوجائیں گے۔کہ مغرب نے مذہبی قتل عام ختم کردیا، مغرب نے عہد جدید کے نئے مذہب ماڈرن ازم کے سامنے کھڑے ہونے والے ہر مذہب، تہذیب اور قوم کا خاتمہ کردیا لیکن مغرب سے ناواقف جہل مرکب جاوید غامدی فرمارہے ہیں کہ مغرب نے مذہبی قتل عام ختم کرلے۔غامدی صاحب ساحل کا اگست، ستمبر ۲۰۰۵ء کے شمارے پڑھ لیں جس میں مغرب کے مذہبی و عسکری تشدد کے

ہولناک اعداد وشمار مستند حوالوں کے ساتھ محفوظ کر دیے گئے ہیں، ساحل]

سوال: میں بھی تو ان کی انہی خوبیوں کی جانب آپ کی توجہ مبذول کروا رہا ہوں اس کے علاوہ انسانی فطرت کی انھوں نے زیادہ لحاظ داری کی۔

غامدی: انھوں نے انسانی فطرت کی لحاظ داری بھی کی اور اس کو پامال بھی کیا۔ میرے پاس میرے دین کی دی ہوئی ایک نعمت خاندانی نظام ہے۔ اس سلسلے میں آج بھی مغرب اپنی ساری جدوجہد کے باوجود انتہائی پستی کے مقام پر کھڑا ہے۔ لیکن دوسری طرف ان کے پاس ایک اجتماعی نظام ہے جس کے سامنے ہم پستی پر کھڑے ہیں۔

سوال: ہمارے خاندانی نظام کی جکڑ بندیوں نے سوسائٹی میں فرد کے لیے جو منفی اثرات پیدا کیے ہیں وہ آپ کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوں گے؟

غامدی: دنیا کا کوئی نظام بھی عملی خامیوں سے پاک نہیں ہوتا۔ اصل چیز تو یہ ہے کہ یا تو آپ عمل کا تقابل کریں گے یا علم کا کریں گے۔ میں نے تو آپ کو پہلے بھی یہی کہا ہے کہ مغرب دنیا کو وہ اقدار دینے میں کامیاب نہیں ہو سکا جس پر ساری دنیا کو اکٹھا کیا جا سکے۔

سوال: آپ ان کے معاملے میں عمل دیکھتے ہیں اور اپنے معاملے میں فوراً نظریات لے آتے ہیں یہ انصاف نہیں ہے؟

غامدی: میں نے تو کہا ہے کہ عمل کی دنیا میں وہ بہت بلند ہیں اور ہم بہت پست ہیں اور نظریات میں ہم انتہائی بلند ہیں اور وہ بہت پست ہیں لیکن جو باتیں وہ آج کہہ رہے ہیں یہ ہم نے چودہ سو برس قبل کہہ دیں۔

سوال: کیا اسلامی سزاؤں میں بھی اب اسی ریشو سے اضافہ ہونا چاہیے؟

اسلامی حدود دوابدی ہیں: غامدی

غامدی: جہاں خدا کی شریعت نے کھڑا کر دیا ہے وہی آخری چیز ہے۔ اس نے آپ کو وہاں کھڑا کر دیا جس سے آگے بہتر جگہ آج تک دریافت ہو سکی ہے اور نہ ہو سکے گی۔ یہ بات تو آپ کو اس وقت کہنی چاہیے تھی کہ قرآن چودہ سو سال پرانی کتاب ہے، یہ کتاب اتنی سخت سزائیں پیش کر رہی ہے جب کہ دنیا اتنی مہذب ہو گئی ہے کہ اگر زنا بالجبر [Rape] بھی کرنا ہوتا ہے تو پہلے اخباروں میں باقاعدہ اشتہار دیا جاتا ہے کہ میں یہ کام کرنے آ رہا ہوں۔ تب تو ٹھیک ہے۔ ابھی تو میں دیکھ رہا ہوں کہ مذہبی درندگی کی بنا پر کیا کچھ ہو رہا ہے۔ مسجدوں میں جا کر کس طرح انسانوں کو قتل وغارت کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور یہ نہیں کہ یہ سب کچھ مغرب میں ختم ہو گیا ہے بلکہ مغرب میں اس سے بھی بڑے پیمانے پر ہوتا ہے۔ آپ پتہ نہیں کس مغرب کو پڑھتے ہیں۔ اس مغرب کو بھی پڑھتے ہیں جس کا سب سے بڑا دارالحکومت واشنگٹن ہے، اس واشنگٹن میں کسی شریف آدمی کے لیے وائٹ ہاؤس سے چند قدم آگے چلنا ممکن نہیں۔ ابھی تک وہاں پر اتنے زیادہ جرائم ہیں۔

مسلمانوں پر دہشت گردی کا الزام غامدی

میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمارے ہاں لوگوں پر بالجبر اپنا نقطہ نظر ٹھونس دینے کے بعض علم برداروں نے یہ تاثر پیدا کیا ہے کہ مسلمانوں کی بڑی اکثریت اگرچہ اس کے خلاف ہے لیکن اس کی خاموشی کی وجہ سے یہی تاثر نمایاں ہو گیا ہے۔ ہمیں اس تاثر کو پوری قوت سے دور کرنا چاہیے اور اس میں الزامی جواب کا یہ طریقہ کہ مغرب بھی یہی کرتا ہے، ہرگز اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ دنیا میں

امن، سلامتی، آزادی، حریت اور بنی آدم کی وحدت ہماری اقدار ہیں۔ہمیں اہل مغرب کو بتانا چاہیے کہ اس وقت دہشت گردی کے حوالے سے جو کچھ اسلام کے نام پر سامنے آرہا ہے وہ اسلام کی غلط تعبیر ہے اور اس کے خاتمے کے لیے ہم مغرب کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر جدوجہد کر سکتے ہیں۔[امریکہ نے ۵۰ سال میں نو کروڑ سرخ ہندیوں کو قتل کیا لیکن غامدی صاحب اسے دہشت گردی نہیں کہتے، اگر فرض کرلیں کہ مسلمانوں نے ورلڈ ٹریڈ ٹاور میں تین ہزار لوگ واقعتاً سچ مچ مار دیے تب بھی نو کروڑ لوگوں کو قتل نہیں کیا۔امریکہ کے مقابلے میں ہم بہت چھوٹے دہشت گرد ہیں، مغرب نے تین سو سال میں ایک ارب پچھہتر کروڑ لوگ ہلاک کیے ہیں لہٰذا دہشت گرد مغرب ہے، اسلام نہیں اس سلسلے میں غامدی صاحب درج ذیل کتابوں کا مطالعہ فرمالیں تو وہ دہشت گرد امریکہ اور دہشت گرد مغرب کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالنے کے بجائے اپنے منہ میں انگلیاں دبالیں گے مغربی دہشت گردی کی یہ کہانیاں مولویوں نے نہیں لکھیں مغرب نے لکھی ہیں غامدی صاحب کی اور تمام جدیدیت پسندوں کی جہالت یہ ہے کہ ان کتابوں کو پڑھے بغیر مغرب کو انسانیت نواز سمجھتے ہیں اور عالم اسلام کے مولویوں کو دہشت گرد اور اسلامی تحریکوں کو تشدد پسند سمجھتے ہیں یہ مولوی اور اسلامی تحریکیں مغرب کے مقابلے میں کروڑوں درجے پرامن، محبت کرنے والے لوگ ہیں مغرب کی دہشت گردی کی مختصر تاریخ یہ ہے۔

1. *Nash, G. 1992. Red, White and Black: The Peoples of Early North America, 3rd ed. Englewood Cliffs, N.J.: Prentice Hall.*
2. *Stannard, D. 1992. American Holocaust: The Conquest of the New World. New York: Oxford University Press.*
3. *Sheehan, B. 1973. Seeds of Extinction: Jeffersonian Philanthropy and the American Indian. Chapel Hill: University of North Carolina Press.*
4. *Wallace, A. 1999. Jefferson and the Indians: The Tragic Fate of the First Americans. Cambridge, Mass.: Belknap Press.*
5. *Hoxie, F. 1984. A Final Promise: The Campaign to Assimilate the Indians, 1880-1920. Lincoln: University of Nebraska Press.*
6. *La Perousse, J.-F. 1989. Monterey in 1786: Life in a California Mission: The Journals of Jean Francois de la Perousse, ed. M. Margolin. Berkeley: Heyday Books.*
7. *Paddison, J. 1999. A World Transformed: Firsthand Accounts of California Before the Gold Rush. Berkeley, Calif.: Heyday Books.*
8. *Nichols, D. 1978. Lincoln and the Indians: Civil War Policy and Politics. Columbia: University of Missouri Press.*
9. *Phillips, G. 1975. Chiefs and Challengers: Indian Resistance and Cooperation in*

Southern California. Berkeley & Los Angeles: University of California Press.

10. *Hurtado, A. 1988. Indian Survival on the California Frontier. New Haven, Conn.: Yale University Press.*
11. *Heizer, R. 1993. The Destruction of California Indians. A Collection of Documents. Lincoln: University of Nebraska Press.*
12. *Brown, D. 1970. Bury My Heart at Wounded Knee: An Indian History of the American West. London: Barrie & Jenkins.*
13. *Churchill, Ward. 1997. A Little Matter of Genocide: Holocaust and Denial in the Americas, 1492 to the Present. San Francisco: City Light Books.*
14. *Cocker, M. 1998. Rivers of Blood, Rivers of Gold. London: Jonathan Cape.*
15. *Prucha, F. 1994. "Andrew Jackson's Indian Policy: A Reassessment," in Hurtado & Iverson (eds.), Major Problems in American Indian History.*
16. *Madsen, B. 1994. "Mormons, Forty-Niners, and the Invasion of Shoshone Country," in Hurtado & Iverson (eds.), Major Problems in American Indian History.*
17. *J. M. Gran The origions of war 2 vols Groningen: Origin Press 1995.*
18. *Glen D Paige Nonkilling Global Political Science Philadelphia: X Libris Corporation 2002.*
19. *Allen D. Grimshaw "Encyclopedia of violence, peace conflict 3 volumes N. Y. Academic Press 1999.*
20 *Chles W. Kegley and Wiltt Kopfe World politics: Trend & Transformation 6th London Macmillan Press LTD 2000.*
21. *JACK Porter Genocide and Human rights: A Global Anthology Lanham, Maryland, University Press of America 1982.*
22. *Chalk F. & K. J. The History and Sociology of Genocide, New Haven 1990.*
23. *Chany I. W. [Ede] Encyclopedia of Genocide Vol. 1 - 2 Santa Barbara California 1999.*
24. *Horowitz, I.L Taking lives: Genocide and State Power New Brunswick, New Jersy 1997.*

25. Kupuer, L. Genocide, Its political use in the Twentieth Century New Haven 1981

براعظم امریکا کی آبادی افریقہ اور یورپ سے زیادہ تھی:

Non Killing Global Political Science کے مقدمہ نگار ڈاکٹر سکندر مہدی کے مطابق: قبل از قتل عظیم [Mega Murder] براعظم امریکہ کی مقامی آبادی اس وقت کی افریقہ اور یورپ کی مجموعی آبادی کے مقابلے میں زیادہ بڑی تھی۔ امریکہ کے قدیم باشندوں میں سے ۸۰ لاکھ افراد براہ راست جنگ میں موت کا شکار ہوئے یا پھر جنگ اور تشدد سے تعلق رکھنے والے امراض اور شکست کے باعث موت سے ہم کنار ہوئے۔

اسی لاکھ سرخ ہندی اکیس سال میں ہلاک کیے گئے:

سکندر مہدی کی تحقیقات کے مطابق یہ ۸۰ لاکھ سرخ ہندی کولمبس کے امریکہ پہنچنے کے صرف اکیس سال کے اندر ہلاک ہوئے، صرف دو عشروں میں اتنے بڑے پیمانے پر امریکہ کے اصل باشندوں کا قتل عام اس بہیمیت کا منظر نامہ پیش کرتا ہے جو عیسائیت سے انحراف اور مغربی فکر و فلسفے کے فروغ کا لازمی نتیجہ تھا۔

اسٹینرڈ کے مطابق پندرہویں صدی کے اختتام پر کرۂ ارض پر دس کروڑ سے زیادہ افراد بستے تھے اور چند صدیوں کے بعد ان کی تعداد تقریباً ۵۰ لاکھ رہ گئی لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ ساڑھے نو کروڑ لوگ کہاں چلے گئے۔ مائیکل مین کی کتاب Dark Side of Democracy اس موضوع پر ہلکی سی روشنی ڈالتی ہے لیکن یہ روشنی بھی بہت دھندلی ہے اس کے مطابق براعظم امریکہ میں نو کروڑ سرخ ہندیوں کو قتل کر دیا گیا تھا۔ جب کہ سکندر مہدی، ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری اور علی محمد رضوی مقتول سرخ ہندیوں کی تعداد صرف اسی لاکھ یا ایک کروڑ بیان کرتے ہیں لیکن مائیکل مین کی تحقیقات نے تاریخی گرد و غبار کو صاف کر کے سرخ ہندیوں کے قتل عام کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔

Encyclopaedia of Violence Peace and Conflict Vol.II میں Genocide and Democide کے موضوع پر تحقیقات میں ثابت کیا گیا ہے کہ بیسویں صدی سے قبل معلوم تاریخ کے ایک ہزار برسوں میں ایک کروڑ سے زیادہ افراد قتل کیے گئے جن میں ۲۲۱ قبل مسیح اور ۹ ویں صدی کے اختتام کے مابین تین کروڑ چالیس ہزار افراد ہلاک کیے گئے۔ افریقیوں کو غلام بنانے کے نتیجے میں ایک کروڑ ۷۰ لاکھ افراد قتل ہوئے۔

یورپی باشندوں کی آمد سے لے کر ۱۹ ویں صدی کے اختتام تک نصف مغربی کرہ میں ایک کروڑ ۴۰ لاکھ افراد قتل کیے گئے۔ اس طرح یہ چار قتلِ عام تقریباً دس کروڑ افراد کا احاطہ کرتے ہیں۔ [انسائیکلو پیڈیا آف وائلنس، پیس کنفلکٹ تین حصے اکیڈمک پریس، ص ۶۰، ۱۹۹۹ء]

تقابل: ہٹلر کے مقتولین اور براعظم امریکہ کے مقتولین:

یہ بات حیرت انگیز ہے کہ ایک ہزار سال کی تاریخ میں جتنے لوگ ہلاک اور قتل کیے گئے اس سے زیادہ تعداد امریکہ کے یورپی آبادکاروں کے ہاتھوں صرف ایک صدی میں قتل کر دی گئی۔ ایک ہزار سال میں ۶ کروڑ لوگوں کا قتل عام لیکن صرف ایک صدی میں دنیا کے مہذب ترین انسانوں کے ہاتھوں جو نئی روشنی، نشاۃ ثانیہ، تحریک تنویر، رومانی تحریک، عقلیت، علم، بنیادی حقوق، لبرل ازم، انسانیت، آزادی اور انسان کی خدائی کے دعوے لے کر اٹھے تھے ان کے ہاتھوں صرف ایک صدی میں نو کروڑ سرخ ہندیوں کے نشیمنوں پر

بجلیوں کا کارواں گزر گیا اور دنیا خاموش رہی۔ اعداد وشمار کی جادوگری بھی عجیب ہے۔ براعظم امریکہ میں سرخ ہندیوں کے قتل عام کی تاریخ معلوم کرنے اور اس سلسلے میں اعداد وشمار جمع کرنے کے لیے انٹرنیٹ پر ۲۶ ہزار ویب سائٹس کا مطالعہ کیا گیا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ چند ویب سائٹس کے سوا بیشتر سائٹس اس قتل عام کے بارے میں خاموش ہیں اور جن سائٹس پر معلومات مہیا کی گئی ہیں وہ ادھوری، ناقص، نامکمل، محرف، اور نہایت مختصر ہیں اس کے برعکس ہر ویب سائٹ ہٹلر اور ترکوں کے مظالم کی عجیب وغریب کہانیاں سناتی ہے جب کہ ہٹلر اور ترکوں نے مجموعی طور پر اتنے لوگوں کا قتل عام نہیں کیا جس قدر قتل عام امریکہ کے اصل باشندوں کا تہذیب جدید کے معماروں نے کیا۔

براعظم امریکہ کے اصل باشندوں کو لوٹنے، برباد کرنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے گئے اس کی ہلکی سی جھلک مائیکل مین کے درج ذیل بیان میں دیکھی جاسکتی ہے۔

They needed labor, but their early attempts to capture and tie Indians to dependent labor failed. These hunter-gatherers wasted the land; they did not improve it, they were idle. From John Locke to contemporary Israelis dispossessing Palestinians, Europeans have argued that those who work and improve the land are entitled to it. The New World was thus vacuum domicilium or terra nullius, an "empty" home or land, the bounty of God to civilized peoples. They made lesser attempts to employ the natives, convert them to Christianity, intermarry with them, or culturally assimilate them.

Like the frying of Indian men, women, and children in villages they had torched - as "God laughing at his enemies"[page No.84]

یورپی آبادکاروں نے ان معصوم سرخ ہندیوں کو کس طرح تباہ وبرباد کیا اس کی ایک جھلک مائیکل مین کے مطابق:

The Indians' environment became degraded and they died, even without wars. The settlers had the political and military power to achieve these dire ends without much risk to themselves. There were forcible mass deportations of sick and hungry natives, whose chances of survival outside their traditional lands were poor. The Indians were crowded on to smaller and smaller hunting lands and reservations. Many Europeans recognized the relentless ethnocide this involved but did nothing. [page No.85]

سرخ ہندیوں کے لیے گالی نما القابات:

یورپی آبادکار مقامی باشندوں کو جاہل، بت پرست، ملحد، پلید، ناپاک، کیڑے مکوڑے، گنوار، کتے، بھیڑیے، سانپ، سور اور بے عقل گوریلے کے نام سے پکارتے تھے۔ بھوک اور پیاس کے باعث ان باشندوں کی قوت مزاحمت ختم کردی گئی تو ان پر بے شمار بیماریاں حملہ آور ہوگئیں جس سے یہ کیڑے مکوڑوں کی طرح مرنے لگے ان کی موت کا مہذب متمدن یورپی آبادکاروں کو کوئی دکھ تھا نہ

افسوس نہ صدمہ اور نہ غم کیونکہ یہ انسان ہی نہیں تھے لہٰذا انسانیت کے زمرے سے خارج لوگوں سے ہمدردی بھی خارج از امکان تھی۔ بیماریوں کے باعث مرنے والوں کی ہلاکت پر یورپی آبادکار خوشی کا اظہار کرتے اور اسے خدا کی عظیم مہربانی اور رحمت کے نام سے یاد کرتے۔ سفاکی، درندگی، بہیمیت کی یہ کہانی مغربی مؤرخین و مصنفین کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

Europeans perceived an enormous difference in civilizational level between themselves and natives. The natives were illiterate, "idolatrous," "heathen," "naked," and "dirty." Before their own arrival, this had been a land "full of wild beasts and wild men," "a hideous and desolate wilderness." The settlers could distinguish between the proud bearing and military skills of the Plains Indians and the lightly clad hunter-gatherers of California, described as "beasts," "swine," "dogs," "wolves," "snakes," "pigs," "baboons," and "gorillas." But ultimately, Indians were "savages." Divine Providence was there for all to see in the form of disease. John Winthrop described the smallpox epidemic of l6l7 as God's way of "thinning out" the native population "to make room for the Puritans." William Bradford wrote, "It pleased God to visit these Indians with a great sickness and such a mortality that of a thousand, above nine and a half hundred of them died. Followers of the Lord, he said, could only give thanks to "the marvelous goodness and providence of God" (quotes from Nash, 1992: 136; Stannard, 1992: 238). Whatever they did to the natives could be justified ideologically. [PageNo.85]

کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ یورپی آبادکاروں اور سرخ ہندیوں کے درمیان افہام و تفہیم پیدا ہو جاتی، مائیکل مین اس کا جواب نفی میں دیتا ہے اور اس کا ذمہ دار خدا اور سائنس کو ٹھہراتا ہے۔

Civilization might be learned, but race was fixed. God plus science reinforced economic, military, and political power to make it difficult for Europeans and Indians to live among each other. [PageNo.86]

افسوسناک بات یہ تھی کہ کلیسا جو انسانیت کا دعوے دار تھا نسل کشی کے اس عمل میں سفید فام باشندوں کا ہم خیال تھا امریکا اور آسٹریلیا میں اس کا کیا کردار رہا؟ اس کی ایک جھلک درج ذیل تحریر میں ملاحظہ کیجیے:

The various churches were much closer to the white settler communities they served. Though local priests and ministers might be more moderate than their congregations, they had little power over them. As in Australia, they played second humanitarian fiddle to missionary movements, which provided the main early pressure group for assimilating rather than eliminating natives. [PageNo.87]

سرخ ہندیوں کو اپنی تہذیب، تاریخ اور مذہب میں سمونے کی کوشش کی گئی لیکن سرخ ہندی اپنی تاریخ، روایات اور مذہب سے اتنے پیوست تھے کہ یہ تمام کوششیں ناکام ہوگئیں، روشن خیال امریکی صدور سرخ ہندیوں کو عیسائی بنانا چاہتے تھے لیکن یورپی آبادکار اپنے معاشروں میں سرخ ہندیوں کے وجود کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

Presidents Washington and Jefferson, several secretaries of war, and federal Indian agencies all worked closely with missionaries and schools in this assimilation project. They warned that any resistance would meet with certain defeat, but they did not conceive of assimilation as coercive. This was not popular with most settlers, who opposed all assimilation. [Page No.88]

جن سرخ ہندیوں نے یورپی آبادکاروں کی تہذیب، تمدن، مذہب کو اختیار کرلیا وہ بھی اجنبی رہے اور سفید فام معاشرے نے انھیں قبول کرنے سے انکار کردیا، کیوں کہ سرخ ہندی یورپی آبادکاروں کے خیال میں بنیادی طور پر انسان کے روپ میں بھیڑیے تھے، جانوروں کی کھالوں، ہڈیوں میں ملبوس درندے تھے، جنھیں خدا نت نئی بیماریوں کے ذریعے ہلاک کررہا تھا تاکہ سفید فام نسلوں کے ہاتھ ان کے خون سے رنگین نہ ہوں اور نسل کشی کا کام زمین کے بجائے آسمان سے قدرتی آفات کے ذریعہ ہوتا رہے۔ سفید فاموں کے اندر شمولیت کی خواہش رکھنے اور کوشش کرنے والوں کا انجام کیا ہوا؟ انھیں نہ سرخ ہندیوں کے معاشرے میں جگہ ملی نہ انھیں سفید فام اقلیت نے قبول کیا۔ یہ طبقہ بے یارومددگار ہوکر تہس نہس ہوگیا۔

Neither community was much interested in intermarriage. Prominent colonials and traders fathered children by Indian women, but they rarely legitimized them. Permanent interracial unions were commoner among frontier traders and laborers in southern colonies with a surplus of males. Mixed blood was accepted in Indian communities, but most of the few Indians or half-breeds who tried to join white society were rejected (Nash, 1992: 280-5). Cherokees who had become private propertied planters were rejected in the 1820s, and when Cherokees acquired permanent political institutions, the State of Georgia would not accept them. It lobbied hard for the deportation of the Cherokee and achieved this in l834 (Champagne, l992: l33, l43-6).

سرخ ہندیوں کو اپنی تہذیب وثقافت میں جذب کرنے، تحلیل کرنے، خلط ملط کرنے [Assimilation] کا عمل جب بری طرح ناکام ہوگیا تو سرخ ہندیوں کے تحفظ کی وکالت کرنے والے اپنے موقف سے دستبردار ہوگئے اور طے کیا گیا کہ سرخ ہندیوں کو مسسپی کے مغرب میں نئے قبائلی علاقوں کی طرف جلاوطن کردیا جائے۔ ۱۸۳۰ء میں جب جلاوطنی کا یہ عمل شروع ہوا تو ہزاروں سرخ ہندی راستے میں ہلاک ہوگئے۔ ہلاکت کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان باشندوں کو دشوار گزار، خطرناک، ناہموار، غیرآباد راستوں کے ذریعے پیدل ہانک دیا گیا تھا، خطرناک جنگلات ہولناک راستوں سے گرتے پڑتے، ہزاروں معصوم لوگ عورتیں، بچے، بوڑھے بھوک پیاس کے ہاتھوں راستے میں مرکھپ گئے، میلوں تک یہ لوگ پیدل منظم مگر جبری اجتماعی نقل مکانی کے لیے چلتے رہے، منزل دشوار راستہ کٹھن نہ ابتداء کی خبر نہ انتہا معلوم، بھوک، پیاس اور افلاس نے ہزاروں کو راستے ہی میں موت کی وادی میں پہنچادیا۔ یورپی آبادکار انھیں ہمسائے

کے طور پر کسی صورت قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ تہذیب انسانیت کے علمبردار اپنے سوا کسی کو انسان ماننے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ ہمسایہ تو وہی بن سکتا ہے جو ہم جنس ہو، صحبت ناجنس یورپی آبادکاروں کو گوارا نہ تھی، Hoxie کے مطابق یہ حکمت عملی طے کرلی گئی تھی کہ KILL THE INDIAN SPARE THE MAN اس حکمت عملی کی تفصیل پڑھیے:

The late l9th century eventually saw some moderation into a combination of cultural suppression and segregated assimilation, a policy sometimes known as "kill the Indian, spare the man." Indians were now assimilated as a marginalized underclass on peripheral reservations. [PageNo.90]

اس دور میں بعض رحم دل لوگ بھی زندہ تھے جو سرخ ہندی وحشیوں کو انسان بنانا چاہتے تھے لیکن اسے نہایت مشکل کام سمجھتے تھے، ان کے خیال میں سرخ ہندی غیر تعلیم یافتہ، غیر متمدن، مرکزی قیادت سے مبرّیٰ وحشی نسل تھے جو اپنی بھوک مٹانے کے لیے کوئی بھی طریقہ آزما سکتے تھے۔ یہ کام بہت مشکل تھا کہ اس وحشیانہ نسل SavageRace کو ایک ایسے معاشرے میں تبدیل کردیا جائے جو انسانیت پسند، عیسائی، تمدنی اور صنعتی اثرات کا حامل ہو، رحم دل لوگوں کی نظر میں سرخ ہندی کیا تھے اس کا اندازہ سرخ ہندیوں کے بارے میں ان کے رحم دلانہ خیالات سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ یہ رحمدل لوگ جن میں Father Fremin Lasuen جیسے لوگ نمایاں تھے، سرخ ہندیوں کو زندگی کی ضمانت اس بنیاد پر دینا چاہتے تھے کہ انھیں عیسائی بنالیا جائے اور انھیں اپنی تہذیب وثقافت میں ضم کرلیا جائے اس کے سوا سرخ ہندیوں کی بقاء، زندگی اور حفاظت کا کوئی طریقہ نہیں تھا۔ مائیکل مین کے مطابق:

He wanted to save the Indians through conversion and assimilation. He knew this was difficult. Indians were "without education, without government, religion, or respect for authority, and they shamelessly pursue without restraint whatever their brutal appetites suggest to them." How could he transform "a savage race... into a society that is human, Christian, civil and industrious"? "This can be accomplished only by denaturalizing them. It is easy to see what an arduous task this is, for it requires them to act against nature. But it is being done successfully by means of patience and by unrelenting effort." Indians were in a "state of nature," different from the Spanish gente de razon, people of reason. While in their state of nature, created by God, they were to be treated benignly as free men. Though savages, they could not be exploited, still less driven away or killed. [PageNo.87]

عیسائیت کے مظالم سرخ ہندیوں پر:

المناک بات یہ تھی کہ عیسائیت قبول کرنے کے بعد بھی ان کی زندگی غم والم سے نشاط وطرب کی طرف لوٹنے سے قاصر تھی، جلاوطنی کا دکھ سہنے کے بعد طوعاً یا کرہاً یا بہ رضا ورغبت عیسائیت قبول کرنے کے باوجود ان کی زندگی کے شب وروز انسانوں کے شب وروز سے مختلف تھے، عیسائیت قبول کرتے ہی وہ دائمی قیدی بن جاتے تھے۔ انھیں جبری مشقت کے کاموں میں شریک ہونا پڑتا جس میں یہ جبر

بھی شامل تھا کہ وہ لاطینی زبان میں طویل مناجات پڑھیں، جن کا ایک لفظ بھی وہ سمجھنے سے قاصر تھے، اگر وہ ان امور سے چھٹکارا پانے کا سوچتے اور وہ کام یا دعا سے فرار اختیار کرتے تو انھیں کوڑے مارے جاتے اور مجبور کیا جاتا کہ وہ لاطینی زبان میں مزید مناجات کا ورد کریں، صرف یہی نہیں ان جرائم کی سزا اور بھیانک تھی، کبھی زنجیروں میں جکڑے جاتے، کبھی ان کے ہونٹ گرم لوہے سے داغے جاتے، ان کے لیے فرار کے تمام راستے بند تھے کیونکہ فرار ہو کر کہاں جاتے، کوئی ان مفلوک، بے بس، درماندہ انسانوں کو پناہ دینے کے لیے آمادہ نہ ہوتا۔ نہایت خراب خوراک اور شدید محنت کے باعث ان کی صحت گرتی ہوئی دیوار تھی، ان کے جسم کے کھنڈرات بتاتے تھے کہ یہ عمارتیں کبھی عظیم الشان بھی رہی ہوں گی، صحت کے ان کھنڈرات پر وباؤں، بیماریوں کا زبردست حملہ جاری رہتا اور ان حملوں میں بچ جانے کا امکان برائے نام ہوتا، لاکھوں سرخ ہندی اسی طرح مرنے پر مجبور کیے گئے۔ یہ موت رحم دلوں کی طرف سے عطا کردہ رحم دلانہ موت تھی، جو قاتلوں کے خیال میں شاید اس موت سے بہتر تھی جو سنگ دلانہ طریقے پر پہلے عطا ہوتی تھی۔

But once Indians were baptized, everything changed. They were now under the authority of the order, and the order became a prison. Long hours of forced work in the fields were followed by hours of forced prayers in Latin, of which they understood not a word. Indians girls were locked up at night. If Indians showed any independence, or refused to work or pray, they were shackled and whipped and forced to recite more Latin. If they ran away, the soldiers forcibly brought them back, shackled them, and whipped them more. Sometimes they would crop off an ear or brand a lip. The Indians had difficulty escaping, since independent Indian villages would not take them in. [PageNo.88]

رحم دلی کے آغاز، ارتقاء اور اختتام کی کہانی مائیکل مین نے تین سطروں میں کفنا دی ہے۔ جبر ظلم کی یہ تاریخ اس بات کی شہادت ہے کہ عیسائیت کا زوال اس وجہ سے بھی ہوا کہ وہ نسلی امتیاز کے راستے پر رواں دواں ہوگئی، آج تک کلیسا کا اسقف اعظم افریقہ کا حبشی پادری منتخب نہیں ہوسکا، پوپ پال کی نجی سپاہ جو دنیا کی مختصر ترین فوج ہے اس کے سپاہی ہمیشہ سوئٹزرلینڈ کی گوری نسل سے لیے جاتے رہے، دو سال قبل پہلی مرتبہ سپاہ مختصر میں دو کالے سپاہیوں کو بھرتی کا پروانہ عطا کیا گیا۔

The Franciscans committed local ethnocide, unintentional but devastating. Half of California's Indians died during the mission period, almost all from diseases introduced there amid a population weakened by too much coerced work and too little food. [PageNo.88]

سرخ ہندیوں کی عبرت ناک اموات:

۱۸۴۸ء میں کیلی فورنیا کو ملک میکسکو سے کاٹ کر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی ایک ریاست بنا دیا گیا جس کے نتیجے میں سرخ ہندیوں کے بالارادہ قتل میں حیرت انگیز اضافہ ہوا، اس قتل عام کی سب سے بڑی وجہ جبری امراض اور بھوک سے زوال پذیر قوت مزاحمت کے باعث بیماریاں تھیں، صرف دس فی صد سرخ ہندی براہ راست قتل کیے گئے جب کہ ساٹھ سے ستر فی صد مقامی آبادی کو بھوک، قحط، نسل کشی، عورتوں مردوں کی شادیوں پر قدغن، کم شرح افزائش اور خطرناک بیماریوں کے ذریعے جو محض اتفاقی اور حادثاتی

نہیں تھیں، قسطوں میں ہلاک کر دیا گیا۔ جبری غذائی قلت کا شکار یہ سرخ ہندی جو سالوں سے قوت مزاحمت کھو رہے تھے، ان بیماریوں کا خاص نشانہ تھے، اگر ان کے جسم تنومند ہوتے، انھیں پیٹ بھر کر مناسب خوراک وقت پر ملتی ان کی صحت قابل رشک ہوتی تو یقیناً یہ بیماریوں کا مقابلہ کر سکتے تھے، لیکن ان کو لاغر، کمزور، ناتواں شاید اسی لیے رکھا گیا تھا تا کہ یہ بیماریوں کے پھیلائے جال میں آسانی سے لقمہ اجل بن سکیں اور ان کی موت کا ذمہ دار گردش ساں کو ٹھہرایا جائے اور قاتل ہر الزام سے بری ہو جائیں۔ بیماریوں، وبائی امراض سے بچاؤ کے لیے حکمراں طبقات اور یورپی آبادکاروں نے کوئی اقدام نہیں کیا، سرخ ہندیوں کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا، یہ مہذبانہ قتل عام تھا، پہلے عیسائی بنایا گیا پھر بھوکا مارا گیا، پھر بیماریوں کے علاج کے لیے سہولت مہیا نہ کی گئی۔ اس کے برعکس حبشی غلاموں کو بیماریوں سے تحفظ کے لیے سفید فام یورپی آبادکاروں نے بھرپور رہنمائی کی، انھیں چیچک سے بچایا گیا کیونکہ وہ قیمتی اور کارآمد تھے، اس کے برعکس سرخ ہندیوں کو مرنے دیا گیا بلکہ حبشیوں کے اتارے ہوئے کمبل سرخ ہندیوں کو دیئے گئے تا کہ وہ چیچک سے مر جائیں۔ مائیکل مین کے الفاظ میں اس المناک باب کو پڑھیے:

In California the interlinked categories of disease, malnutrition, and starvation killed somewhere around 60-80 percent of natives, direct killing about 10 percent, with most of the remainder attributable to reproductive failure. Deliberate killings were usually in cold blood or in situations of such an imbalance of force that the appellation murder is applicable. But none of these categories are entirely separable from each other. Malnutrition, starvation, and low fertility often resulted predictably from settler policy, while diseases were not entirely accidental. Diseases spread most rapidly where malnourished natives were herded closely together, as in California missions and the many U.S. Indian reservations located on marginal lands. The settlers were not ignorant of the disease mechanisms involved, yet they rarely took steps against epidemics to which they themselves were immune. Nor were they unhappy with the results. Nash (1992: 300-1) compares the white responses to the spread of disease among Indians and black slaves. Since slaves were valuable, the white community tried to combat epidemics among them. Slaves were inoculated against smallpox. Indians were not. Indeed, some settlers fomented disease. Reports of donations of disease-ridden blankets to Indians have become notorious, though rare. [Page No.89]

کیلی فورنیا: سرخ ہندیوں کا قبرستان

کیلی فورنیا میں سرخ ہندیوں پر گزرنے والی شب ستم، آنسوؤں اور لہو سے تحریر کرنے کے قابل ہے۔ ان انسانوں کو براہِ راست قتل کرنے کے بجائے قسطوں میں موت کشید کرنے کے لیے کیسے کیسے طریقے اور تجربے کیے گئے اس کا تصور کرنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سرخ ہندیوں کی عورتوں کو مردوں سے الگ کر دیا گیا تا کہ نسل میں اضافہ نہ ہو اور سرخ ہندی مرد لواطت کے

ذریعے جسمانی عوارض میں مبتلا ہوجائیں۔عورتوں کوطوائف بننے پر مجبور کیا گیااور پھر جن طوائفوں کوخطرناک جنسی بیماریاں منتقل ہوئیں انھیں جنسی خدمات انجام دینے کے لیےسرخ ہندی مردوں کے سپرد کردیا گیا تا کہ یہ بیماریاں ان میں منتقل ہوجائیں اوروہ تڑپ تڑپ کر جان دے دیں۔سرخ ہندیوں کوشراب کا رسیا بنایا گیا تا کہ ان کی اخلاقی اقدار زوال پذیر ہوجائیں اوران کی ہلاکتوں میں مزید اضافہ ہو۔ یہ شراب مشنریوں اور حکومتی پابندیوں کے باوجود محنت کے عوض مہیا کی جاتی تھی۔جنسی بیماریاں، کمزور صحت اور تولیدی صلاحیتوں کے خاتمے کا باعث بن گئیں۔۱۸۴۸ء سے ۱۸۶۰ء تک کیلی فورنیا کی سرخ ہندی آبادی پندرہ لاکھ سے کم ہوکر صرف اکتیس ہزار رہ گئی جب کہ سفید فاموں کی آبادی ۲۵ ہزار سے بڑھ کر ساڑھے تین لاکھ ہوگئی۔۱۸۶۰ء میں سرخ ہندیوں کی مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد میں کمی کا اہم عامل مردوں اور عورتوں کی بالجبر علیحدگی تھی۔سرخ ہندی عورتیں اپنے دشمنوں کے بچوں کوجنم دیتی تھیں لیکن انھیں اس بات کی اجازت نہ تھی کہ وہ اپنے بچوں کوجنم دے سکیں اور اپنی نسل کو زمین وآسمان دیکھنے کے لیے دنیا میں آنے دیں نہ اپنے مردوں کے لیے راحت کا سامان بن سکیں،سرخ ہندی جنسی راحت کے لفظ سے ناآشنا ہوگئے تھے۔ان کی زندگی بدترین زندگی تھی،انھیں محض اپنی زندگی کی بقاء کے لیے محنت کی اجازت تھی تا کہ وہ زندگی اور موت کے مابین معلق رہیں اور آقاؤں کی غلامی کا شرف حاصل کریں۔

جمہوریت اور بہیمیت کا فطری تعلق:

سرحدی علاقوں سے منتخب ہونے والے ریاستی سطح کے افسران انتہا پسندی میں سب سے آگے تھے۔وہ زمینوں پر ناجائز قبضے اوراس پر مزاحمت کے عمل سے بچنے کے لیے زیادہ سخت حکمت عملی اختیار کرتے تھے۔۱۸۲۰ء اور ابتدائی ۱۸۳۰ء کے عرصے میں شمالی قانون ساز ادارے نے کامیابی سے بے دخلی کا عمل شروع کروایا اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ اس سفر کے اختتام پر سرخ ہندیوں پر کیا گزرے گی۔سرخ ہندیوں کو بے دخل کیے جانے کے بعد ان سے خالی ہوجانے والی زمینوں کی امداد اور محصولات سے حاصل ہونے والی رقوم پر کئی مقامی سیاستدانوں نے خوشی کا اظہار کیا۔یہ جمہوری رویہ تھا،جمہوریت اور بہیمیت، وحشت و درندگی لازم وملزوم ہیں انھیں اس بات پر یقین تھا کہ سرخ ہندیوں کی بے دخلی کے بعد ان علاقوں سے وہ دوبارہ منتخب ہوجائیں گے کیوں کہ سرخ ہندیوں کے حق میں بیانات دینے والے انتخابی عمل میں کامیابی کا کوئی امکان نہیں پاتے تھے لہٰذا جمہوری عمل کا تقاضہ یہی تھا کہ اپنے حلقۂ انتخاب کی خواہش،تمنا اور آرزوؤں کی صورت گری کی جائے یہی جمہوریت کا سیاہ چہرہ ہے جو لوگوں کو مفاد کا اسیر اور حرص وحسد کا غلام بنا دیتی ہے۔

سرخ ہندیوں کو مارنے کی آزادی:

کیلی فورنیا میں صورت حال واضح تھی۔۱۸۵۰ء میں جب جمہوریت اپنی انتہائی جدید شکل میں موجود تھی کیلی فورنیا کے آئین میں سفید فام مردوں کے حق رائے دہی کو یقینی بنایا گیا۔انھیں اس بات کا بھی اختیار دیا گیا کہ سرخ ہندی اپنے مخصوص علاقوں سے نکل کر کہیں پھرتے ہوئے نظر آئیں تو انھیں طاقت سے بھگا دیا جائے یا مزدور بنالیا جائے،اس میں بچوں کی بھی تخصیص نہیں تھی۔قانون سازی کے ذریعے آبادکاروں کی ملیشیا کو پکڑ دھکڑ کی مکمل خودمختاری دے دی گئی اور اس کے لیے ۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۱ء میں گیارہ لاکھ ڈالر ادا کیے گئے۔سرخ ہندیوں کے لیے مخصوص کیے گئے علاقے انتہائی چھوٹے اور بالکل بے آباد زمینوں پر تھے ان میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ مزید بے دخل کیے جانے والے سرخ ہندی سما سکیں۔بے دخل کیے جانے کا مطلب ان کی موت تھا اس پر قانون سازوں نے کبھی بھی تنقید نہیں کی۔

سرخ ہندیوں کے خلاف، ان کے خاتمے تک جنگ کا اعلان:

گورنر برنٹ Burnett کو اس وقت مشکل صورتحال کا سامنا کرنا پڑا جب اس نے بعض تحفظات کی وجہ سے سرخ ہندیوں کے ساتھ مصالحت سے انکار کر دیا اس کے بعد سرخ ہندیوں کے لیے خطرات بڑھنے لگے اور یہ تناؤ نسل کشی تک پہنچ گیا۔ سرخ ہندی زمینوں پر سفید فاموں کا قبضہ اور اس کے جواب میں سرخ ہندیوں کی مزاحمت کی وجہ سے وہ سرخ ہندی جو اب تک منتشر تھے جنگی سربراہوں کے زیر اثر منظم ہونے لگے تھے۔ (Phillip 1975-Chp3-5) [Phillips, G. 1975. Chiefs and Challengers: Indian Resistance and Cooperation in Southern California. Berkeley & Los Angeles: University of California Press.]

Burnett نے قتل عام کا اعلان کیا اور کہا Not to conciliate but to escalate to genocide برنٹ نے اعلان کر دیا کہ:

A war of extermination will continue to be waged between the two races until the indian becomes extinct.

''دو مختلف نسلوں کے درمیان جنگ سرخ ہندیوں کے مکمل خاتمے تک جاری رہے گی اس کے پیش رو Mc Dougall نے اعلان کیا کہ کئی قبائل کا خاتمہ لازمی ضرورت ہے۔ (Hurtado 1988:134-6) The war must of necessity be one of extermination to many of the tribes. [Hurtado, A. 1988. Indian Survival on the California Frontier. New Haven, Conn.: Yale University Press.]

ہٹلر اور کیلی فورنیا کے گورنروں کا تقابل:

تاریخ بتاتی ہے کہ ہٹلر نے بھی کبھی ان دو انتہا پسند گورنروں کی طرح ایسے بے باکانہ بیانات نہیں دیے وہ جانتا تھا کہ جرمن اس کو مسترد کر دیں گے جبکہ ان گورنروں کو یقین تھا کہ سفید فام آبادی ان وحشیانہ بہیمانہ بیانات کو بخوشی قبول کرے گی۔ لہٰذا وہ سرخ ہندیوں کے خلاف زہر افشانی کرتے رہے، جبکہ ہٹلر نے ایسا نہیں کیا۔ ان کے بعد آنے والا گورنر Birglar ان سے مختلف نہیں تھا فوج کے نام ایک خط میں اس نے سرخ ہندیوں کے بارے میں لکھا:

the acts of these Savages are sometimes signalized by a ferocity worthy of. . . cannibals . . . They seem to cherish an instinctive hatred toward the white race, and this is a principle of their nature, which neither time nor vicissitude can impair. This principle of hatred is hereditary . . . The character and conduct of these Indians . . . [means] . . .that Whites and Indians cannot live in close proximity in peace.

''ان وحشیوں کے افعال آدم خوروں کی طرح خونخوار ہوتے ہیں وہ سفید فاموں سے اندرونی نفرت پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ان کی فطرت کا مظہر ہے جسے نہ تو وقت نہ کوئی اور شے تبدیل کر سکتی ہے۔ نفرت کا یہ اصول وراثتی ہے، سرخ ہندیوں کا یہ رویہ اور کردار اس بات مظہر ہے کہ سفید فام اور سرخ ہندی امن کے ساتھ ایک جگہ نہیں رہ سکتے''۔

سرخ ہندیوں کے خلاف نفرت کی تاریخ:

Birglar نے اپنے خط کا اختتام فوج سے اس مطالبے پر کیا کہ وہ چاروں علاقوں[countries] سے تمام سرخ ہندیوں کو نکال باہر کرے۔ کہاں؟ اس بات کا جواب اس نے نہیں دیا اس کام کے لیے اس نے کیلی فورنیا کی ملیشیا کی خدمات پیش کیں۔ [Heizer, R. 1993. The Destruction of California Indians. A Collection of Documents. Lincoln: University of Nebraska] (Heizer, 1993:189-91)

تمام سرحدی ریاستوں کے سیاست دان، آبادکار اور اخبارات اسی قسم کے متشددانہ جذبات رکھتے تھے اور اسی طرز عمل کے زبردست حامی تھے۔ اس قسم کے جذبات کا اظہار Minnesota کے گورنر Ramsey نے کیا اس نے اعلان کیا:

سرخ ہندی: ''شہر بدر کردو یا ختم کردو'':

''سی اُو Sioux سرخ ہندیوں کو لازمی طور پر ختم کر دینا چاہیے یا ان کو ہمیشہ کے لیے ریاست کی سرحد سے نکال باہر کیا جائے۔'' اس زمانے کا مقبول نعرہ تھا "Exterminate or Banish" ''ختم کردو یا شہر بدر کردو'' تھا۔ جنرل سبلی جو کیلی فورنیا میں دبیز کھالوں کا تاجر تھا سرخ ہندیوں اور وفاقی حکومت دونوں کو فریب دینے کے لیے مشہور تھا اس نے سانتی سوانی قبیلے کو ختم کرنے کے لیے جنگ شروع کی اور اس میں کامیاب ہوا اس نے 770 جلاوطن کیے جانے والے سانتی قبیلے کے افراد کو سینٹ پال کی دخانی کشتی کے ذریعے بے دخل کیا سفید فام دریا کے کنارے کھڑے ان پر پتھر برساتے اور ان کے ساتھ بدسلوکی کرتے۔ (Brown 1970;50-65) [Brown, D. 1970. Bury My Heart at Wounded Knee: An Indian History of the American West. London: Barrie & Jenkins.]

اخبارات کی جانب سے قتل عام کی حمایت:

ریاست کولوراڈو کا گورنر بھی اسی قسم کے نفرت انگیز، متشددانہ، غیر انسانی جذبات کا حامل تھا اس کی ریاست کے تمام اخبارات جو آزادئ صحافت کے علمبردار تھے اس کے نسلی اور سفلی جذبات کے طرف دار تھے اور اس کی مدح میں رطب اللسان رہتے تھے۔ Denver کے اخبارات نے اس کی تعریف کی۔ ان اخبارات نے ۱۸۶۳ء میں ظلم و جبر کی ستائیس کہانیوں میں سے ۱۰ واقعات جو سرخ ہندیوں کے قتل سے متعلق تھے، ان کی کھلم کھلا حمایت کی۔ یہ صورت حال بتاتی ہے کہ اس زمانے کے اخبارات، سیاست دان، عدالتیں، حکومتیں، فوج، مسیحی ادارے، کلیسا اور سواد اعظم کی اخلاقی، ذہنی اور نفسی صورت حال کس قدر بدترین تھی۔ (Churchill 1997; 172) [Churchill, Ward. 1997. A Little Matter of Genocide: Holocaust and Denial in the Americas, 1492 to the Present. San Francisco: City Light Books.]

چار سفید فاموں کے قتل کا بدلہ: ۱۴۴ لوگوں سے!

۱۸۷۱ء میں مویشی اور سفید گھوڑے چوری کرنے کی دو سرخ ہندی چھاپہ مار کارروائیوں کے جواب میں جس میں چار سفید فام باشندے ہلاک ہوئے Tuscon کے شہریوں کی سربراہی میں ایک ٹیم نے سرخ ہندیوں کے ایک قبیلے اپاچی کے گاؤں پر حملہ کر دیا جس کا اس چھاپہ مار کارروائی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ۱۴۴ لوگوں کو ہلاک کیا گیا جن میں مرد صرف آٹھ تھے باقی ۱۳۶ عورتیں تھیں، اکثر عورتوں کی پہلے عصمت دری کی گئی۔ مقامی اخبار Denver News نے قاتلوں کو مبارکباد دی اور اس

بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ مرنے والوں کی تعداد دگنی ہو سکتی تھی۔

عدالتوں میں بے انصافی کی کہانی:

مشرقی علاقے میں غضب کی اس صورت حال کو ''خالصتاً قتل'' قرار دیا گیا اور باغیوں کے سربراہ کو عدالت میں پیش کرنے پر دباؤ ڈالا گیا۔ عدالت میں اس کے خلاف کافی شہادتیں پیش کر دی گئیں لیکن عدالت نے ان افراد کو بری کرنے میں صرف انیس منٹ کا وقت لگایا۔ یہ اس زمانے کا انصاف تھا (1970:202-5;cocker, 1998:220 ۔1) [Brown, D. 1970. Bury (Brown My Heart at Wounded Knee: An Indian History of the American West. London: Barrie & Jenkins.]

[Cocker, M. 1998. Rivers of Blood, Rivers of Gold. London: Jonathan Cape.]

عدالتیں: سرخ ہندی کی شہادت قبول نہیں

بہت ہی کم سفید فام شہری قاتلوں کے طور پر عدالت میں مجرم پائے گئے جبکہ عدالت اس مقابلے میں مستقل مزاجی سے اس روش پر قائم رہی کہ وہ سفید فاموں کے خلاف کسی سرخ ہندی کی شہادت قبول کرنے پر تیار نہ تھی، یہ اس زمانے کی مہذب عدالتیں تھیں۔(for california, see Heizer, 1993:II-14)

[Heizer, R. 1993. The Destruction of California Indians. A Collection of Documents. Lincoln: University of Nebraska Press.]

سرخ ہندیوں کے خلاف جیفرسن اور واشنگٹن کے احکامات:

اگر وفاقی حکومت اور فوج سرخ ہندیوں کی حفاظت کا فریضہ انجام دیتی تو مشنری، آبادکار اور اخبارات اس پر خوب شور مچاتے تھے۔ سفید فاموں کے درمیان تمام اختلافات اس وقت ختم ہو جاتے جب کوئی سرخ ہندی مزاحمت کرتا یا کسی سفید فام مرد یا عورت کو قتل کر دیتا۔ Moodoc قبیلے کے سرخ ہندیوں نے اوریگان اور کیلی فورنیا کی سرحد پر جنرل کیبی کو پکڑ کر قتل کر دیا یہ بات یورپی آبادکاروں کے قومی غم و غصے کا سبب بن گئی اور پوری آبادی میں انتقام کی آگ پھیل گئی۔ جنرل شرمان نے نہ صرف قاتلوں کے گروہ کے قتل کا مطالبہ کیا بلکہ بکھرے ہوئے تمام قبیلوں کے خاتمے کا مطالبہ کیا۔ امریکی فوجیوں اور سوانی لاکوٹا قبیلے کے درمیان ایک جھڑپ میں ۱۸۰ امریکی فوجیوں کی ہلاکت پر جنرل شرمان کو اپنے اس دعوے پر عمل کا موقع مل گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ سوانی قبیلے کے مردوں، عورتوں اور بچوں کے خاتمے تک ہمیں نہایت سنجیدگی اور مستقل مزاجی سے ان کے خلاف لڑنا ہوگا۔ ایک اور شخص جارج آرمسٹرانگ کی موت پر اس قسم کے قومی غم و غصے کا اظہار کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں نہ ختم ہونے والی جنگ شروع ہوگئی جو ۱۸۸۱ء میں تمام سوانی زمینوں پر قبضے اور ان کے مکمل ہتھیار ڈالنے پر ختم ہوئی سرخ ہندیوں کی مزاحمت کو روشن خیال صدور کے دور میں سختی سے کچلنے کے اسباب مہیا کیے گئے اور بے دخلی سے انکار پر نسل کشی کی دھمکی دی گئی۔ بیسویں صدی کے مشہور ترین صدور ''تامش جیفرسن'' سے ''جارج واشنگٹن'' تک اس معاملے میں روشن خیالی کو بالکل بھول گئے۔

جارج واشنگٹن: سرخ ہندی بھیڑیے ہیں:

جارج واشنگٹن نے اپنے جنرل کو ہدیت کی تھی کہ وہ اِرُوکوا قبائل Iroquois پر حملہ کر دے اور "Lay waist all settlement-that the country may not be over run but destroyed and not to listen any over tune

"of peace before the total ruin of their settlement is effected" ''ان کی آبادیوں کو تباہ و برباد کردیں ان کی تمام باقیات کے خاتمے تک امن کا کوئی نغمہ سننے کی ضرورت نہیں ہے''۔اس نے سرخ ہندیوں کو بھیڑیوں سے تشبیہہ دی کہ دونوں وحشی شکاری ہیں صرف شکلوں کا فرق ہے۔ Indians are wolves both being beasts of prey though they different in shape. اس نے اعلان کیا کہ تمام سرخ ہندیوں کو مسی سپی کے مغرب کی طرف دھکیل دیا جائے اور مزاحمت کرنے والوں کو طاقت سے کچل دیا جائے۔جیفرسن نے بھی سرخ ہندیوں کے ساتھ جنگ میں اپنا لہجہ تبدیل کرلیا۔

جیفرسن: سرخ ہندیوں کی جڑیں کاٹ دو

the root-and-branch destruction of hostile tribes or driving them beyond the Mississippi: "nothing is more desirable than total suppression of their savage insolence and cruelties"; "This then is the season for driving them off"; their "ferocious barbarities justified extermination"; "if ever we are constrained to lift the hatchet against any tribe, we shall never lay it down till that tribe is exterminated, or driven beyond the Mississippi . . .. In war, they will kill some of us; we shall destroy all of them."

جیفرسن مسلسل حکم دیتا کہ دشمن قبیلوں کی جڑیں کاٹ دو یا پھر انھیں مسس سپی کے پار دھکیل دو اس کا کہنا تھا کہ ان وحشی قبیلوں کے مکمل خاتمے کے سوا کوئی بات اہم نہیں ہے یہی ان کے نکال باہر کیے جانے کا وقت ہے ان کی وحشی حرکتیں قتل عام کا جواز ہیں۔ اگر ہم ان پر ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہوئے تو ہم اسے ان کے مکمل خاتمے تک نیچے نہیں رکھ سکیں گے۔ جنگ کی صورت میں وہ ہمارے چند افراد کو قتل کریں گے ہم ان کے تمام افراد کو قتل کردیں گے۔۱۸۱۳ء میں اس کا خیال تھا کہ کریک قبیلہ شکست کے بعد معافی کی یہ شرط قبول کرلے گا کہ وہ اپنی تمام آبادی کو مسس سپی سے باہر لے جائیں ورنہ ہم انھیں مجبور کردیں گے۔نہ تو جیفرسن اور نہ ہی واشنگٹن نے برطانیہ جیسے تہذیب یافتہ دشمن کے خلاف یہ زبان استعمال کی۔جیفرسن نے سفید فاموں کے زمینوں پر قبضے کی مکمل پشت پناہی کی اس کے دور صدارت میں دو لاکھ مربع میل سرخ ہندی زمینوں پر اس کے کارندوں نے قبضہ کیا۔

جیفرسن کے خوں خوار احکامات: تحلیل، بے دخلی یا قتل

اس قبضے کے لیے جیفرسن کا فرمودہ تھا کہ وہ سرخ ہندیوں کو قرضے میں جکڑتے اور پھر اس کے بدلے وہ انھیں اپنی زیر ملکیت زمین بیچنے پر راضی کرلیتے،اس طرح سرخ ہندی اپنی آبائی شکار کی زمین سے محروم ہوتے گئے۔جیفرسن نے اپنے حکام کو حکم دے رکھا تھا:

trick the Indians into debt, forcing them to sell their lands. With inadequate land left for hunting, they would have to learn agriculture and then assimilate. If they resisted this, they must be crushed; if they merely languished and starved, that proved the inevitability of their end.

اگر وہ اس پر مزاحمت کرتے تو ان کو کچل دیا جاتا اور اگر وہ فاقہ کشی کرتے تو ان کا خاتمہ لازمی تھا۔جیفرسن کی ترجیح Assimiation تھا اس کے بعد وہ بے دخلی Deportation کا قائل تھا اگر یہ بھی ناکام ہوجائے اور مزاحمت ہو تو وہ قتل عام کا فیصلہ کرتا

جیفرسن کا کہنا تھا کہ وہ ہندی نسل کی سفید فام نسل کے ساتھ برابری کا قائل ہے مگر اعلیٰ تہذیب ہمیشہ کمتر تہذیب پر غالب آتی ہے۔

he believed in the inherent racial equality of Indians (unlike blacks) with whites (Wallace, 1999: 78), but higher must triumph over lower civilizations.

اگرچہ امریکیوں کی اکثریت اس بات سے واقف ہے کہ یہ دونوں صدور واشنگٹن اور جیفرسن غلام رکھتے تھے۔مگر ہندیوں کے لیے ان کے غیض وغضب کی تاریخ سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔

سرخ ہندیوں کے خلاف جیکسن کا اعلان جنگ:

صدر امریکہ اینڈریو جیکسن کے دور صدارت میں صرف تمام سفید فام مردوں کو ووٹ کا حق دیا گیا۔اگرچہ وہ ہندیوں کا حمایتی مشہور تھا اصلاً جیکسن محض ایک عقلمند سیاست دان تھا جو کہ شمالی ریاستوں کے دباؤ پر بے دخلی کی قانون سازی پر راضی ہو گیا اور سفید فام اور ناجائز قابضین کے خلاف ہندیوں کے دفاع کے حق میں تھا مگر اس کا خیال تھا کہ بے دخلی سرخ ہندیوں کی حفاظت کا واحد حل ہے۔ [Prucha, F. 1994. "Andrew Jackson's Indian Policy: A Reassessment," in Hurtado & (Prucha 1994) Iverson (eds.), Major Problems in American Indian History.] یہ دراصل ایک نقاب تھا، سرخ ہندیوں نے بے دخلی پر احتجاج کیا تو وہ غضب میں آ گیا۔صرف ایک سفید فام عورت کو کریک قبیلے کے افراد نے یرغمال بنالیا تو اس نے انتہائی اشتعال اور غیض وغضب کی حالت میں اعلان کیا کہ ''میں ان کے قصبوں میں گھس کر یرغمال اور اغوا کرنے والے دونوں کو برآمد کرلوں گا اور مجھے اس بات میں کوئی جھجک نہیں ہے کہ میں ان کے دیہاتوں کو برباد کردوں ان کے گھروں کو آگ لگادوں ان کے جنگجوؤں کو ختم کردوں، ان کی بیویوں اور بچوں پر قبضہ کرلوں، جب تک کہ یہ ہتھیار نہ ڈال دیں''۔

"I shall penetrate the Creek Towns, until the Captive, with her Captors are delivered up, and think myself justifiable in laying waste their villages, burning their houses, killing their warriors and leading into captivity their wives and children, untill I do obtain a surrender of the Captive, and the Captors." Prucha (p. 212)

جیکسن کے زہریلے ارشادات: سرخ ہندی بھیڑیے

ایک اور موقع پر جیکسن نے سرخ ہندیوں کو ''دھوکہ باز'' اور اذیت پسند'' کا طعنہ دیا اس نے اعلان کیا کہ ''ہمارے مقتولین کا سر حفاظت سے رکھا ہے۔وہ یہ کہتا تھا کہ ہندیوں سے ڈرنا ان سے محبت کرنے سے بہتر ہے۔اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ سرخ ہندی بچوں اور عورتوں کو بھی قتل کردیں۔ایسا نہ کرنا بھیڑیے کو جھولے میں کھلانے کے مترادف ہوگا یہ جانے بغیر کہ وہ کب بھیڑیا بن کر کچھار میں جا پہنچے۔

"the blood of our murdered countrymen must be revenged. The banditt ought to be swept from the face of the earth." He boasted, "I have on all occasions preserved the scalps of my killed." In principle he believed that "fear is better than love with an Indian." He urged his soldiers to kill women and children. Not to do so would be like pursuing "a wolf in the hammocks without

knowing first where her den and whelps were."

اس کے ان بیانات نے اس کے لیے صدارت کی راہ ہموار کی۔ اس نے اپنے دور صدارت میں ہندیوں سے معاہدے کو توڑ ڈالا اور سرخ ہندیوں کی جبری بے دخلی کا عمل شروع کر دیا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس کا ۱۸۳۰ء کا Removal Act رحم دلانہ تھا۔ جبکہ اس کے نتیجے میں مشہور ٹرائل آف ٹیرز (Trial of Tears) میں کریک قبیلے کے دس ہزار، چیرو کی قبیلے کے چار ہزار اور چاکٹا قبیلے کے چار ہزار باشندے ہلاک کیے گئے۔

سرخ ہندیوں کے خلاف لنکن کی مہم جوئی:

سرخ ہندیوں کے معاملے میں لنکن کی بہت زیادہ شمولیت نہیں رہی۔ نوجوان سیاستدان کی حیثیت سے اس نے ہندیوں کے مخالف جنگجو تاثر قائم کرنے کے لیے Black Hawk جنگ میں اپنا عسکری تجربہ استعمال کیا اس نے zencheryTaylor کی وحشیوں کے عسکری استحصال اور winfield scot کے چیرو کی قبیلے کی بے دخلی کے اقدامات کی تعریف کی۔ اس کے دور میں ہندی ایک جزوی مسئلہ تھے صرف ایک دفعہ اسے سرخ ہندیوں کے خلاف ہولناک بڑا فیصلہ کرنے کی ضرورت پیش آئی جب اس نے Minnesota میں عسکری حملے اور ہندی زمینوں پر قبضے کا حکم جاری کیا اس فیصلے کی وجہ سے ۱۸۶۲ء میں سوانی قبیلہ بغاوت پر مجبور ہوا جس کو فوج نے کچل دیا اور ۳۰۹ سوانی افراد کو گرفتار کر لیا۔ لنکن کو ان افراد کی پھانسی کا فیصلہ کرنا تھا۔ انسانیت پسندوں اور قتل عام کے حمایتوں کی طرف سے دلائل جاری تھے۔ مقامی افراد اور گورنر Ramsey تمام افراد کے قتل کے حامی تھے تاہم اس نے ۳۹ افراد کی پھانسی کا فیصلہ کیا جو کہ امریکی عدالت کی تاریخ کا پہلا واقعہ ہے جب بیک وقت کثیر تعداد میں افراد کی پھانسی کا اعلان کیا گیا۔ جبکہ سزا پانے والوں کے خلاف کافی وشافی ثبوت موجود نہیں تھے۔ لنکن کے اس فیصلے سے کوئی بھی مطمئن نہ تھا مگر وہ خوش تھا کہ وہ ایک پیچیدہ صورتحال سے نکل آیا ہے۔ گرفتار شدگان کی اکثریت جیل کی اذیتوں کی وجہ سے ہلاک ہوگئی۔ لنکن کو یقین تھا کہ سرخ ہندی اعلیٰ نسل کے مقابلے میں جلد ہی ختم ہو جائیں گے۔ وہ سرخ ہندیوں سے نفرت کرتا تھا اس نفرت کا اظہار لنکن نے ۱۸۶۳ء میں وائٹ ہاؤس میں ایک قبائلی وفد سے گفتگو کرتے ہوئے کیا۔

''پیلے چہرے والے لوگ لاتعداد اور خوشحال ہیں وہ زمین پر کاشت کاری کرتے ہیں۔ اور اپنی روٹی پیدا کر کے کھاتے ہیں اور وہ شکار کے کھیل کے بجائے زمین کی پیداوار پر انحصار کرتے ہیں۔ وہ سرخ ہندی نسل کے برخلاف ایک ایسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو ایک دوسرے کو قتل کرنا اور ایک دوسرے سے لڑنا پسند نہیں کرتی''۔

the pale-faced people are numerous and prosperous because they cultivate the earth, produce bread and depend upon the products of the earth rather than wild game for a subsistence. This is the chief reason of the difference; but there is another . . . we are not, as a race, so much disposed to fight and kill one another as our red brethren. (Nichols, 1978: 187)

لنکن کے ان تعصّبانہ خیال کے چند روز بعد ہی سفید فام مہذب انسانوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوگئی لنکن کے الفاظ تاریخ نے مسترد کر دیئے تھے۔ مہذب سفید فام سرخ ہندیوں کے ساتھ ساتھ اب ایک دوسرے کو بھی قتل کر رہے تھے۔ وحشی کون تھے، تاریخ اس حقیقت سے نقاب الٹ رہی تھی۔ وحشت کا سفر یہیں ختم نہیں ہوا یہ سفر جاری تھا جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ جب تک کہ تمام دنیا پر اس کا تسلط قائم نہ ہو جائے۔

روز ویلٹ کے خیال میں مردہ ہندی بہترین آدمی ہے:

انیسویں صدی کے اختتام پر نسل کشی کا عمل ختم ہو رہا تھا امریکہ کے پانچویں عظیم جمہوریت پسند صدر تھیوڈور روز ویلٹ کو اس میں حصہ ڈالنے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی اس نے قتل عام کے بارے میں کہا کہ اس کے سوا چارہ کار نہ تھا۔'' It was ultimately beneficial as it was inevitable ''اس نے مزید کہا'' تمام جنگوں میں سب سے عظیم جنگ وہ ہے جو وحشیوں کے خلاف ہے میرے خیال میں بہترین سرخ ہندی وہ ہیں جو مر چکے ہیں اور میرا خیال ہے کہ دس میں سے نو ہلاک ہو چکے ہیں۔ اور دسویں کے بارے میں مجھے کوئی جستجو نہیں ہے۔

that the noblest of all wars was one of extermination against savages. "I don't go so far as to think that the only good Indians are dead Indians, but I believe nine out of ten are, and I shouldn't like to inquire too closely into the case of the tenth."

[Sheehan, B. 1973. Seeds of Extinction: Jeffersonian Philanthropy and the American Indian. Chapel Hill: University of North Carolina Press.] [Stannard, D. 1992. American Holocaust: The Conquest of the New World. New York: Oxford University Press.] [Wallace, A. 1999. Jefferson and the Indians: The Tragic Fate of the First Americans. Cambridge, Mass.: Belknap Press.] [Cocker, M. 1998. Rivers of Blood, Rivers of Gold. London: Jonathan Cape.]

Sheehan 1973: 206, 29, 244, Stannard (1992, 19-22, 245-6), Wallace (1997:65,235-8 and Cockor (1998:206)

امریکی صدر کے اعلانات کا جمہوری پس منظر:

وہ جمہوریت پسند صدور جو اپنے حلقہ انتخاب کی ضروریات سے آشنا تھے ان کے اندر شاہی نسل پسندی زیادہ نظر آتی ہے۔ تا کہ اپنے حلقۂ انتخاب کی زیادہ سے زیادہ توجہ حاصل کر سکیں، اپنے حلقہ انتخاب میں مقبولیت کا جمہوریت میں صرف ایک ہی طریقہ اور ایک ہی راستہ ہے کہ رائے دہندگان کو ہرگز ناراض نہ کرو، ان کی خواہشات اور مطالبات کو پورا کرنے کے لیے اپنی جان لڑا دو یہ جمہوری عمل کا بنیادی نقص ہے اس نقص کی تلافی صرف انسانیت کے دعوؤں کے ذریعے ہی ممکن ہے عملاً کچھ نہیں ہوسکتا، لہٰذا جمہوری عمل میں شریک ان صدور نے جمہوریت کے تحفظ کے لیے جمہوری طریقوں کے عین مطابق ایسی حکمت عملیاں مرتّب کیں جو اس عبرت ناک جبر سے بھی آگے بڑھ گئیں جو نسل کشی کے لیے اختیار کی گئیں تھیں۔ زمینوں پر قبضہ کرنے کا عمل اور سرخ ہندی مزاحمت، ان آبادکاروں کے بہیمانہ جذبات کا جواز بنا۔

مغربی فکر و فلسفے، سرمایہ دارانہ نظام، سرمایہ دارانہ شخصیت، مذہب دشمن اقدار، تصور نفس کے خود ساختہ نظریات، الوہیت انسانی کے دعوؤں اور آخرت کے انکار کے باعث جس خلق جدید کی تعمیر سترہویں صدی کے بعد ہوئی جس کے بارے میں فوکو نے کہا تھا کہ انسان تو اٹھارہویں صدی میں پیدا ہوا ہے اس انسان کے کردار، اخلاق، تہذیب، شرافت، اصول، روایت اور برتاؤ کی پوری تاریخ پانچ امریکی صدور واشنگٹن، لنکن، جیفرسن، روز ویلٹ اور جیکسن کے بیانات میں دیکھی جا سکتی ہے۔

مائیکل مین نے ان پانچ امریکی صدور کے بارے میں عجیب بات لکھی ہے:

How many of these presidents would be prosecuted today for genocide by an international war crime tribunal? Four I think excluding Roosevelt. [PageNo.91]

نو کروڑ قتل: پچاس برس!

امریکہ میں ریاستی سطح پر امریکہ کے اصل باشندوں کے خلاف ظلم و جبر کے یہ ابواب تحریر کیے جا رہے تھے تو آبادکاروں کی سطح پر سرخ ہندیوں کے خلاف غم و غصہ، اشتعال، نفرت کے جذبات بہیمیت کی انتہاء پر تھے۔

براعظم امریکہ کے اصل سرخ باشندوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے، ان کی آبائی زمینوں سے ہٹانے، ان کی نسلوں کو تباہ کرنے، انھیں برباد، تہس نہس کرنے کا یہ عمل پچاس برس میں تکمیل پذیر ہو گیا تھا۔ سرخ ہندیوں کا قتل عام کرنے کے لیے خوبصورت اصطلاحیں، دل فریب نعرے، دفاع کی حکمت عملی، اپنی مظلومیت کا ڈھنڈورہ اور سرخ ہندیوں کی وحشت و بربریت کی جھوٹی کہانیاں گھڑی جاتی تھیں، اس تمام عمل میں حکومت، ریاست، عدالت، اخبارات، کلیسا سب ہم آواز تھے کسی سرخ ہندی کی بیوی سے جبری زیادتی کی جاتی یا بھوکے سرخ ہندی بھوک سے مجبور ہو کر یورپی آبادکاروں کے جانور چوری کر کے ذبح کر لیتے یا کھا پی لیتے تو قیامت گزر جاتی۔ عدالت میں کیلی فورنیا کے ایک باشندے کو لایا گیا تو اس نے بیان دیا:

I believe for every beef that has been killed by then ten or fifteen Indians have been killed.

سفید فام مہذب آبادکاروں کے ہاتھوں سرخ ہندیوں کی زندگی کتنی اذیت ناک تھی اس کی تصویر مائیکل مین کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

It editorialized about a man called McElroy who had a deer stolen from him. He retaliated by killing an Indian man and his squaw and wounding a third. Then McElroy was murdered as Indians also retaliated. But the death of a white man brought in the California militia. They found an Indian camp, killed 9 Indian men (the rest fleeing), and then butchered its 40 defenseless women and children. This newspaper reported on another occasion that a 36-strong militia unit looking for the killers of a white man found an Indian village and killed all but 2 or 3 of its 150 inhabitants - men, women, and children. The captain of another army unit wrote proudly, "The number killed I confidently report at not less than 75 and have little doubt it extended to nearly double that number." A captain of different sensibilities criticized a Californian rancher who killed two or three Indians, believing that an Indian had stolen some of his cattle. The next day, the cattle were found. Indians then avenged their dead relatives by killing the rancher. The captain was now trying to prevent further escalation (Heizer, l993: 42-3,63-79,84-90,95-7,l56-7,245,249-50).

گھوڑے چوری کرنے پر تمام سرخ ہندی واجب القتل ہوگئے:

ریاستِ مزدوری Missouri کے تین سفید فاموں کا کہنا تھا کہ وہ ہر اس سرخ ہندی کو قتل کردیں گے جو ان کے سامنے آئے۔ کیوں کہ سرخ ہندیوں، نے ان کے گھوڑے چوری کر لیے تھے۔ ایک کے جرم پر پوری نسل کو معتوب قرار دینا کسی بھی جھگڑے کا نصف سبب ہوتا تھا''۔ (Madsen, 1994:316) Madsen, B. 1994. "Mormons, Forty-Niners, and the Invasion of Shoshone Country," in Hurtado & Iverson (eds.), Major Problems in American Indian History.]

سرخ ہندیوں کے خلاف عسکری یلغار:

سفید فاموں کا مقصد ہندیوں کا مکمل خاتمہ تھا اور سفید فاموں میں تناؤ کی وجہ محض ہتھیاروں یا ان کے نظم وضبط کی برتری نہیں تھی بلکہ یہ اس غم وغصے کا بھی نتیجہ تھا کہ ایک کمتر، جنگلی اور بدتہذیب قوم ایک برتر قوم کے خلاف کس طرح شدید مزاحم تھی ان کی دنیا خوف، فساد اور ظلم کی وجہ سے گراوٹ کا شکار تھی جیسا کہ مختلف صدور کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ سفید فاموں کی اکثریت ہندیوں کے مکمل خاتمے کی حامی تھی۔ اس سلسلے میں مزاحمت کی سب سے بڑی تحریک ۱۸۸۰ء کی سیاہ فاموں کو غلام بنانے کے خلاف ردعمل کی تحریک تھی۔ اگرچہ یہ بہت تاخیر سے شروع ہوئی مگر اس نے بہت سی جانیں بچالیں۔

قتل عام کرنے والی عسکری طاقت میں فوج اور آبادکاروں کی ملیشیا شامل تھی۔ فوج اپنے اسلحہ اور ابلاغی طاقت کے زور پر زیادہ ہندیوں کو قتل کرسکتی تھی۔ فوج کو امن قائم کرنے، سرخ ہندی چھاپہ مار کارروائیوں کو روکنے، سرخ ہندی تحاریک کو کچلنے، اور سرخ ہندیوں کو ان کے مخصوص علاقوں سے بے دخل کرنے کے کام تفویض کیے گئے تھے۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے مختلف طریقے استعمال کیے جاتے تھے۔ فوج کے منصوبے کے مطابق سرخ ہندیوں سے مذاکرات کیے جاتے تھے کہ وہ یہ جگہ چھوڑ کر اپنے لیے مخصوص کیے گئے بے آباد خطوں میں چلے جائیں، جو سرخ ہندی مذاکرات پر راضی نہیں ہوتے ان پر سخت تشدد کیا جاتا۔

سرخ ہندیوں کے خلاف بہیمانہ جذبات: قتل کردو یا نکال دو

خانہ جنگی کے بعد فوج نے دورانِ جنگ سیکھی ہوئی عیارانہ حکمت عملی پر عمل کرنا شروع کیا اور میدانی علاقوں کے قبیلوں پر مقامی نسل کشی کا ارتکاب کرنا شروع کیا اور اپاچی اور دوسرے قبائل کا قتل عام کیا۔ شرمان عسکری چیف آف اسٹاف تھا اس نے ۱۸۶۶ء کی جنگ میں اپنی چالوں کو اس طرح بیان کیا ''میرے خیال میں اگر ہم پچاس سرخ ہندیوں کو آرکنساس اور پلیٹ کے درمیان چھوڑ دیں تو ہمیں ہر اسٹیشن، ہر سڑک، ہر ریل گاڑی کی حفاظت کرنی پڑے گی۔ پچاس شر پسند سرخ ہندیوں کے لیے تین ہزار فوجی تعینات کرنے پڑیں گے۔ اس سے بہتر ہے کہ جتنا جلد ممکن ہو ان سے نجات حاصل کرلی جائے۔ یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ ان کو بہلا پھسلا کر بے دخل کردیا جائے یا پھر قتل کردیا جائے''۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

My opinion is, if fifty Indians are allowed to remain between the Arkansas and the Platte we will have to guard every stage station, every train, and all railroad working parties . . . fifty hostile Indians will checkmate three thousand soldiers, Rather get them out as soon as possible, and it makes little difference whether they be coaxed out by Indian commissioners or killed.

سرخ ہندیوں کا وحشیانہ قتل عام:

اس کا مقصد ان سرخ ہندیوں سے مقابلہ کرنا تھا جو متحرک اور چھوٹے گروہوں کی صورت میں جنگ کرنے کے ماہر تھے۔لہٰذا ان سے اس وقت جنگ شروع کی جاتی جب وہ سردیوں کے لیے بنے ہوئے رہائشی دیہاتوں میں چلے جاتے،ان کی نقل و حرکت محدود ہوجاتی اور وہ خاص علاقوں میں محصور ہوجاتے اس وقت ان جنگجوؤں کو اپنی عورتوں،بچوں اور املاک کی حفاظت کی خاطر ایک جگہ کھڑے ہوکر مقابلہ کرنا پڑتا۔آبادکاروں کی فوج کو یقین تھا کہ منجمد جنگ کی صورت میں قتل عام کی صلاحیت بہتر ہوتی ہے اور دشمن کو زبردست نقصان پہنچا کر اس کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے۔(Uttely:1994) تاہم ان کی جنگی صلاحیت ان مردوں،عورتوں اور بچوں کے خلاف براہ راست استعمال ہوتی تھی جو اپنے دیہاتوں سے بھاگنے کی کوشش کرتے اگر وہ فرار ہونے میں کامیاب ہوجاتے تو انھیں اپنی املاک سے ہاتھ دھونا پڑتا اور ایسی جگہوں کو زندگی بسر کرنے کے لیے منتخب کرنا ہوتا جہاں زندہ رہ جانے کی امیدیں بہت کم ہوتیں اور اگر وہ فرار میں ناکام ہوتے تو انھیں ایک ساتھ ہی قتل کردیا جاتا۔

وحشیانہ قتل عام پر ایک جنرل کا شدید احتجاج:

شرمان کے ماتحت افسر جنرل Sanborn نسل کشی کی اس حکمت عملی پر سخت برہم تھا۔سیکریٹری داخلہ کو ایک خط میں اس نے لکھا:

> ''ہماری جیسی طاقت ور قوم کے لیے،چند خانہ بدوشوں سے ایسے حالات میں گھرے ہوئے لوگوں سے جنگ جاری رکھنا قابل شرم ہے یہ ایک ایسا عمل ہے جس نے ہمیں،ہماری آئندہ نسلوں اور پوری انسانیت کی نظروں میں ہمیشہ کے لیے گرادیا ہے''۔

For a mighty nation like us to be carrying on a war with a few straggling nomads, under such circumstances, is a spectacle most humiliating, an injustice unparalleled, a national crime most revolting, that must, sooner or later, bring down on us or our posterity the judgement of Heaven.

مظالم پر تنقید کرنے والوں کو مسترد کردیا گیا:

جنرل سن بورن جیسے غیرت مند جنرل بہت کم تھے تاریخ نے انھیں بھلا دیا۔ایک جنرل کی جانب سے نہتے مظلوموں کے خلاف وحشیانہ جنگی کارروائیوں پر احتجاج کے باوجود آج تک ان جرائم پر سرخ ہندی باشندوں سے کبھی معذرت نہیں کی گئی شاید یہ تہذیب کا تقاضہ ہے۔

مگر جنرل شری دان نے خود پر تنقید کرنے والوں کی تنقید کو مسترد کرتے ہوئے انھیں ایسے 'متقی کلیسائی' قرار دیا، جو ان وحشیوں کے مددگار اور ہمدرد ہیں جنھوں نے مردوں،عورتوں اور بچوں کو قتل کیا ہے۔اس کی وضاحت ایک ردعمل کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔شری دان کی شخصیت،ہتھیار ڈالنے والے سرخ ہندیوں کے ساتھ ایک مکالمے میں ظاہر ہوتی ہے جس میں ان کے سربراہ نے خود کو ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں متعارف کراتے ہوئے کہا Tosawi, good Indian کہا تھا، جنرل شری دان نے جواب دیا ''مرا ہوا سرخ ہندی ہی میری نظر میں اچھا سرخ ہندی ہے'' بعدازاں اس کے بدنام زمانہ الفاظ مشہور ہوگئے کہ:

The only good Indian I ever saw is dead Indian" (Broown, 1970: 157-8, 170-I)

[Brown, D. 1970. Bury My Heart at Wounded Knee: An Indian History of the American West. London: Barrie & Jenkins.]

سرخ ہندیوں کے خلاف عسکری کارروائیاں:

شری دان اور شرمان سرخ ہندیوں کے خلاف جنگ میں کمان کے سربراہ رہے اور ان کی ظالمانہ تدبیریں آبادکاروں اور سیاستدانوں میں پسندیدہ رہیں اور انھوں نے انتہائی اطمینان سے اپنے مقاصد حاصل کیے عسکری حکمت عملی کی اخلاقیات کا انحطاط قاتلانہ نسل کشی کا حصہ رہا۔

دشمن سے نفرت اس قسم کی عسکری حکمت عملی کا لازمی حصہ ہوتی ہے۔ اس میں دشمن کی ضروریات کی فراہمی کے ذرائع کو منقطع کر دیا جاتا ہے جو کہ لڑائی نہ کرنے والے گوریلے انھیں فراہم کرتے ہیں یہ چالیں انیسویں صدی میں میدانی سرخ ہندیوں کے ساتھ جنگ میں استعمال کی گئیں۔ بہادر جنگجو کوئی مخصوص یونیفارم نہیں پہنتے تھے لہٰذا ہر سرخ ہندی مرد دشمن ہو سکتا تھا۔ محفوظ طریقہ یہ ہے کہ تمام سرخ ہندی مردوں کو قتل کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ جنگی حکمت عملی کے طور پر دشمن کو ایسے مقام پر دفاع پر مجبور کر دیا جاتا جہاں مرد عورتیں اور بچے اکٹھا ہوں۔ اس قسم کی عسکری چالیں شدید ظالمانہ تھیں۔

آبادکاروں کی ملیشیا کو ریاست اور مقامی حکومتوں کی طرف سے امداد دی جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے ان کے اندر نسل کشی کا جذبہ اور بھی تازہ رہتا تھا۔ یہ جنگجو جز وقتی ملازم ہوتے، اور انھیں سرخ ہندیوں کے سر کے بدلے اجرت دی جاتی تھی۔

ہر سرخ ہندی کو قتل کر دو:

کرنل شونگٹن جو کولوراڈو کی تیسری ملیشیا کا کمانڈو اور سابق ضابطہ پرست وزیر تھا اس کا کہنا تھا کہ ''میرا مقصد ہر اس سرخ ہندی کو قتل کرنا ہے جو میرے سامنے آئے، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ چھوٹے سے اس کی مراد بچے تھے جیسا کہ وہ کہتا تھا 'انڈے ہی جوں بنتے ہیں۔

"kill and scalp all, little and big." "Little" meant children, for as he said, "Nits make lice."

ایک عسکری افسر سرخ ہندیوں کے ساتھ مذاکرات کا خواہش مند تھا جب اس نے شونگٹن کی ملیشیا کے بارے میں استفسار کیا تو اس کے گورنر نے جواب دیا:

''انھیں سرخ ہندیوں کو ختم کرنے کے لیے تیار گیا تھا اور وہ انھیں قتل کر کے ہی چھوڑیں گے''۔

سپاہی، عورتوں کے اعضاء کے تمغے اٹھائے پھرتے تھے

۱۸۶۴ء میں Sand Creek میں کرنل شونگٹن نے ایسا ہی کیا اس کی فوج نے ۱۰۵ سرخ ہندی عورتوں اور بچوں اور ۲۸ مردوں کو قتل کیا اور ان کے اعضاء کاٹ ڈالے۔ اس کی فوج کے سپاہی جو تمغے اٹھائے پھر رہے تھے وہ عورتوں کی فرج [vagina] سے

بنائے گئے تھے۔ یہ مہذب متمدن یورپی آبادکاروں کا حال تھا جو آج دنیا کو انسانیت اور اخلاقیات کا درس دے رہے ہیں۔ (Brown [Brown, D. 1970. Bury My Heart at Wounded Knee: An 1970:86-93 Stannard 1992-171-4) Indian History of the American West. London: Barrie & Jenkins.] [Stannard, D. 1992. American Holocaust: The Conquest of the New World. New York: Oxford University Press.]

غامدی صاحب دہشت گردوں کے ہاتھ میں بخوبی ہاتھ ڈال کر اظہار یکجہتی کریں، جدیدیت پسندوں کا خاص کام سامراج کی دست بستہ لب بستہ، صف بستہ حاشیہ برداری ہے، ساحل] جہاں تک مغرب سے مکالمے اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالنے کا تعلق ہے اس کے لئے امریکہ کے ریاستی فلسفی رچرڈ رارٹی کا مکالمہ ذیل میں پڑھیے:

RICHARD RORTY: Europe is not just domination, not just hegemony, not just international capitalism. There is also the European mission civilizatrice. That term has been discredited by the behavior of the colonial powers, but it might be capable of being rehabilitated. It was, after all, Europe that invented democracy and civic responsibility. We can still say to the rest of the world: send your people to our universities, learn about our traditions, and eventually you will see the advantage of a democratic way of life. It may be just an historical accident that Christendom was where democracy was reinvented for the use of mass society, or it may be that this could only have happened within a Christian society. But it is futile to speculate about this. However that may be, it seems to me that the idea of a dialogue with Islam is pointless. There was no dialogue between the philosophes and the Vatican in the eighteenth century, and there is not going to be one between the mullahs of the Islamic world and the democratic West. The Vatican in the eighteenth century had its own best interests in mind, and the mullahs have theirs. They no more want to be displaced from their positions of power than the Catholic hierarchy did (or does). With luck, the educated middle class of the Islamic countries will bring about an Islamic Enlightenment, but this enlightenment will not have anything much to do with a "dialogue with Islam."☆

☆ A dialogue between American State philosopher Richard Rorty and Gianni Vatimo from page 72 to 75 Columbia University Press, New York.

رارٹی جاوید غامدی جیسے روشن خیالوں کو بھی مکالمے کے قابل نہیں سمجھتا اور مولویوں کا تو سخت دشمن ہے لہٰذا مکالمے اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالنے کے غامدی صاحب کے نخرے احمقانہ دعوے ہیں بے چارے غامدی صاحب نے مغرب کو پڑھ لیا ہوتا تو ایسی احمقانہ باتیں نہ کرتے۔

مغربی تہذیب اجتماعی اخلاقیات کے ذریعے اسلام کے قریب ہے: غامدی

میرے دل میں ہر اچھی چیز کے لیے تحسین ہوتی ہے ہر اچھائی کے لیے نرم گوشہ رکھتا ہوں خواہ وہ چیز اپنی ہو یا مغرب کی۔ میں طبعاً کسی چیز کے اچھے پہلوؤں کو دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ مجھے ہمیشہ شہد کی مکھی پسند رہی ہے جو پھولوں پر بیٹھتی اور ان سے رس نکال کر لے آتی ہے۔ غلاظت پر بیٹھنے والی مکھی کو میں نے کبھی پسند نہیں کیا۔ مغربی تہذیب نے اجتماعی اخلاقیات میں جو رویہ اپنایا ہے اس کے نتیجے میں وہ ہمارے بہت قریب آ گئی ہے اگر اس نے کہیں غلطی کھائی ہے تو ہمیں آگے بڑھ کر اس کی غلطی اس پر واضح کرنی چاہیے لیکن اچھائی کو تشکر کے ساتھ قبول کرنا چاہیے، انسان کو مغرب اور مشرق کے خانوں میں بانٹنے کے بجائے عالمگیر وحدت کے طور پر مخاطب کیا جائے۔ [غامدی صاحب کو مغربی فکر و فلسفے کا علم نہیں ورنہ اس قسم کی جاہلانہ باتیں نہ کرتے، اس سلسلے میں تفصیلات کے لیے ساحل کا شمارہ مارچ ۲۰۰۷ء اور جون ۲۰۰۶ء ملاحظہ کیجیے۔ مغرب کا اجتماعی اخلاقیات سے کیا تعلق اس کی تاریخ تو مال کمانے کی تاریخ ہے۔ سرمایہ داری کی راہ میں حائل ہر رکاوٹ کو مغرب تشدد سے ختم کر دیتا ہے کیونکہ وہ عالمی سرمائے کا محافظ ہے اور امریکہ اس محافظت کا سب سے اہم ذمہ دار ملک ہے انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ مشرق و مغرب کی مابعد الطبعیات الگ ہے دونوں جگہ انسان کا مطلب مختلف ہے کیونکہ انسان کی تعریف بھی مابعد الطبعیات سے نکلتی ہے مغرب میں Human وہ ہے جو صرف عقل کو ماخذ علم سمجھتا ہے اور کسی خارجی ذریعہ علم سے علم حاصل کرے لہٰذا ہر وہ شخص جو خارجی ذریعہ علم سے علم حاصل کرے گا مغرب کی نظر میں انسان کہلانے کا مستحق نہیں اس کا قتل جائز ہے نو کروڑ سرخ ہندی اس فلسفے کے تحت مارے گئے وحدت انسانیت کی صرف ایک شکل ہے کہ تمام انسان اللہ کے بندے ہیں اسلام اس فکر کا علمبردار ہے مغرب میں بندگی اور الٰہ کا کوئی تصور نہیں لہٰذا وحدت انسانیت کی بات احمقانہ بات ہے۔ جاوید غامدی مغرب کے فکر و فلسفے سے سرسری طور پر بھی واقف نہیں ورنہ اس قسم کی جاہلانہ باتیں نہ کرتے۔ رچرڈ رارٹی امریکی ریاستی فلاسفر کی کتاب Achieving our country کا مطالعہ کر لیں تو غامدی صاحب چوکڑی بھول جائیں گے، مغرب کے فلسفے اور تصور انسان کو سمجھنے کے لئے مارچ ۲۰۰۷ء کا ساحل ملاحظہ کیجیے اس کے علاوہ جنوری ۲۰۰۵ء سے فروری ۲۰۰۷ء کے ساحل میں مغرب کے فکر و فلسفے تصور انسان تصور کائنات پر آپ کو ہر شمارے میں کوئی نہ کوئی مضمون ملے گا۔ ساحل]

۱۹۹۸ء میں مسلمانوں کی تاریخ دنیا کی عظیم الشان تاریخ تھی

گیارہ ستمبر کے بعد مسلمانوں کی تاریخ دنیا کی بدترین تاریخ ہوگئی

جاوید غامدی صاحب کی علمی و تحقیقی بددیانتی کی تحقیق

۲۰/جون ۲۰۰۵ء کی تقریر

غامدی صاحب فرماتے ہیں کہ جب کوئی قوم سمجھتی ہے کہ میں تہذیبی طور پر برتر ہوں تو وہ ہراس قوم کی اصلاح کرتی ہے جس کو وہ غلط سمجھتی ہے۔[آپ دیکھئے تاریخ میں جو جنگیں ہوئی ہیں خواہ وہ مسلمانوں نے کی یا غیر مسلموں نے . کیوں کہ جنگ ایک ذریعہ ہے دوسری قوموں کے معدنی وسائل پر قبضے کا.[نعوذ باللہ انبیاء کرام کا جہاد مادیت کے لئے تھا صحابہ کرام نے روم و ایران کو اس لئے فتح کیا کہ وہ معدنی وسائل پر قبضہ کرنا چاہتے تھے جاہل مطلق غامدی صاحب کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ اس زمانے میں معدنیات کا مسئلہ ہی نہیں تھا حضرت عمرؓ نے تو ایران کی زمین بھی مجاہدین میں تقسیم نہ کی پورا ایران مسلمان ہو گیا. ساحل]جب کوئی قوم سمجھتی ہے کہ سامنے والی قوم اس کے سامنے سرنگوں ہوجائے گی تو وہ اقدام کرتی ہے[یہ بھی احمقانہ دلیل ہے مسلمانوں کا ایرانیوں سے کیا مقابلہ تھا؟روم اور اسلام کا کیا موازنہ، جنگ یرموک میں کیا تقابل تھا اقدام فتح سے نہیں ایمان سے مشروط ہے. ساحل]۔آپ تاریخ کی جنگوں کے افسانے کتنے شوق سے پڑھتے ہیں۔سلطنت روما، سلطنت ایران اس کے بعد مسلمانوں کی سلطنت عیسائیوں کی سلطنت عیسائیوں کی امویوں کی عثمانیوں کی ہر ایک میں اپنی تہذیب کے برتر ہونے کا غلبہ تھا کہ ہم برتر ہیں اس لئے دنیا کے ہر معاملے میں ہماری رائے قائم ہوگی [تہذیب کی برتری کے ساتھ توانائی کے حصول پر دسترس]پوری دنیا پر عثمانی پرچم لہرا رہا تھا وہ جس قوم سے تہذیب سے تعلق رکھتے تھے وہ اس کو برا نہیں سمجھتے تھے کہ عثمانی فوجوں نے ہنگری کے شہنشاہ کو شکست دی البانیہ کو ملیا میٹ کر دیا، آسٹریلیا پر اپنا پرچم لہرا دیا۔اس کے بالکل برعکس جب یہ چیز ہمارے ساتھ ہو رہی ہوتی ہے تو ہم بالکل الگ طریقے سے سوچتے ہیں۔[غامدی صاحب کی مغربی فلسفے، مغربی تہذیب اور مغربی تصور فتح سے کوئی واقفیت نہیں رکھتے اس لئے احمقانہ قسم کی بے بنیاد باتیں کرتے ہیں. اسلام کا پیغام تھا کہ لوگو اللہ کے بندے بن جاؤ نہیں بنتے تو معاہدے کرو اور ذمی بن جاؤ اگر لڑتے ہو تو پھر اللہ کے غلاموں

کے غلام بن جاؤ اسلام ھر انسان کو انسان سمجھتا ھے اور اسے اپنے مذھب پر کاربند رھنے کی اجازت دیتا ھے لیکن مغرب کے فلسفے میں وہ شخص انسان ھی نھیں جو عقل کے سوا کسی اور کو اتھارٹی مانتا ھے لھٰذا اس کا قتل لازمی ھے اس سے کوئی مکالمہ نھیں ھوسکتا نہ معاھدہ . مغرب کھتا ھے کہ عقل کی غلامی قبول کرو اسلام کھتا ھے اللہ کی غلامی قبول کرو یا ذمی بنو یا غلام یا ھم تمھیں معاف کردیں گے. مغرب کھتا ھے کہ عقل کی غلامی کرنے سے انکار کا انجام صرف موت ھے لھٰذا مغرب اور اسلام کو ایک سطح پر کھڑا کرنا جھالت، دین سے بغض اور شرپسندی ھے اس سلسلے میں ساحل مارچ، اپریل، مئی ۲۰۰۵ء کا مطالعہ کیجیے. ساحل]. کہ یہ ظلم ہے یہ بربریت ہے یہ وحشت ہے یہ خیر انسانی تاریخ میں ہوتا رہا ہے۔[۱۹۹۸ء میں زندگی کو انٹرویو میں غامدی صاحب امت مسلمہ کی عظمت کے قصیدے گارھے تھے اب اچانک تمام برائیاں امت میں نظر آنے لگیں . ساحل]انبیا جب کسی معاشرے میں ہوتے ہیں تو انسان کی اس فطرت کو تو بالکل نہیں چھیڑتے کہ وہ تہذیب کی بنیاد پر کسی اور انسانی معاشرے سے افضل ہو انبیاء انسان کی جبلت جو وحشت کی جانب مائل ہوتی ہے اس کو اپنا مخاطب بناتے ہیں۔ کچھ انسانوں کو انسانوں پہ، کچھ رشتوں کو رشتوں پہ، کچھ قبیلوں کو قبیلوں پہ، کچھ قوموں کو کچھ اقوام پہ اور اب سپر پاور ہیں جو اس دنیا کے نظم قائم کئے ہوئے ہیں جب سے ہم دیکھتے چلے آرہے ہیں۔

جس دور میں مسلمان تہذیبی اور تمدنی لحاظ سے برتر تھے تو انھوں نے جو حملے کیے کیا وہ اخلاقی جواز پر پورا اترتے ہیں اس کا فیصلہ تاریخ پر ایک دقت نظر ڈال کر کرنا ہوگا[اس جاھل مطلق کو یہ بھی خیال نھیں ھے کہ ۱۹۹۸ء میں زندگی کو انٹر ویو میں فرمارھے تھے کہ مسلمانوں کی تاریخ کی دنیا میں مثال نھیں ھے اور آج بھی کوئی مغربی ملک ھماری تاریخ کے سامنے پیش نھیں کیا جاسکتا اب امریکی پیسے کے ذریعے خیالات ھی بدل گئے ھیں. ساحل]ہم آج اس فیصلے کے اوپر جو ہم پر مسلط ہو گیا ہے بہت شور مچا رہے ہیں امریکہ نے جو عراق پر حملہ کیا ہے اپنی نفسیاتی اور ٹیکنالوجی کی برتری پر کیا ہے اور اپنے مستقبل کے تحفظات کے لئے امریکہ کا حملہ کوئی نئی بات نہیں ہے اگر ہم اپنا مطالعہ کریں تو بنو امیہ، بنو عباس، بنو عثمان کے بہت سے اقدامات بہت غلط تھے[زندگی کو انٹرویو میں بنو امیہ اور بنو عباس کے جو قصیدے پڑھے گئے وہ پڑھ لیجیے .ساحل]جو اپنی تہذیبی برتری کی بنیاد پر کیے ان کے بعد بہت سے سلاطین نے بھی یہ روش اختیار کی جیسا کہ خوارزم شاہ نے۔ اگر امریکہ نے تہذیبی برتری کی بنیاد پر یہ کیا تو کیا کوئی گناہ کیا یہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔[دوسروں، قوموں، تہذیبوں پر ظلم کرنا انسانی فطرت کے عین مطابق ھے اور دنیا کی تمام برتر تھذیبیں یھی کام کرتی چلی آرھی ھیں دوسرا مطلب یہ ھے کہ تمام انبیاء اور ان کی غالب تھذیبیں بھی دوسری معاصر تھذیبوں قوموں پر ظلم و ستم کرتی تھیں یہ فطری چیز ھے یہ انسان کی عین فطرت کے مطابق ھے غامدی صاحب کے ان جاھلانہ کافرانہ کلمات کی حقیقت واضح ھے ان کا یہ نقطہ نظر ۱۹۹۸ء میں زندگی کو دئے گئے انٹرویو کے بالکل برعکس ھے شاید ارتقاء ھو گیا ھے ان کے یھاں انحراف و ارتقاء مترادف الفاظ ھیں اس شخص کے جاھل مطلق ھونے میں کوئی کلام نھیں. ساحل]

اگر امریکہ سمجھتا ہے کہ اپنے مستقبل کے تحفظات کے لئے اس کو عراق میں ہونا چاہیے تھا تو اس بات کو آپ ایرانی سلطنت رومی سلطنت اور مسلمانوں کی سلطنتوں میں دیکھ سکتے ہیں تاج برطانیہ کی مثال وہ ہندوستان میں آئے۔[غامدی صاحب اہل مطلق ہیں

انہیں قوموں اور تہذیبوں کی تاریخ.....کا علم نہیں قبل ازیں وہ زندگی کو انٹرویو دیتے ہوئے مسلمانوں کی خلافت، حکومت اور ایک ہزار سالہ دور اور خصوصاً بنوامیہ و بنوعباس کے دور کا انسانی تاریخ کا بہترین.....بے مثال دور قرار دے چکے ہیں]

پہلے اتنی اجنبیت نہیں تھی کہ کوئی مسئلہ ہو کہ جیسے بابر گھوڑے پر آیا اور ابراہیم لودھی کو شکست دے کہ تخت پر براجمان ہوا لوگوں نے کہا سبحان اللہ اس وقت اخلاقی جواز کی اتنی کوئی قدر نہیں تھی۔

آنے والی سپر پاور قوموں اٹھیں گی دنیا کی پہلی سلطنت ہام سے تھی سیاہ فاموں سے

سامی سلطنت عثمانی ترک اور ہم سام سے ہیں اور یافت کی قوم ہے سفید نام امریکہ وغیرہ

جب ھم مسلمانوں کے ساتھ شامت کا معاملہ ھوا ھے تو ھم نے اسے سائنسی طور بھی نھیں دیکھا[غامدی صاحب کو سائنس کا مطلب بھی نھیں معلوم سائنسی طریقہ کیا ھوتا ھے اس سے معاملات کو کیسے دیکھا جاتا ھے اگست اور نومبر ۲۰۰۶ء کے ساحل کا مطالعہ کیجیے تو سائنسی طریقے کی حقیقت معلوم ھو گی. ساحل] تہذیبی طور پر بھی نہیں دیکھا ان کے عوامل کا جائزہ بھی نہیں لیا ہم نے اپنی نفسیات یہ بنالی تھی کہ دنیا پر آخری حکومت ہماری قائم ہوگی اب خدا ہمارا ہے ہم خدا کے ہیں لہٰذا ہم جو بھی کریں گے وہ ہمارے ساتھ رہے گا لیکن اللہ نے ایک قانون بنایا ہوا ہے کہ جس کے تحت یہ سلطنت ہمارے ہاتھ سے جاتی رہی ہماری تمام دانش فکری اور اقتصادی معاشرتی تنظیم کو بیٹھ کر سوچنا چاہیے تھا کہ کیا کرنا چاہیے یہی وہ سوال ہے کہ جس سے پتہ چلتا کہ ہم کیوں پیچھے جا رہے ہیں یا رہ گئے ہیں۔ یہ ساری باتیں دو چیزوں کے اصول میں پنہاں ہیں کہ توانائی کا حصول آپ کے ہاں کس مقام پر ہے اور تہذیبی برتری کے ارتقاء کن مراحل میں ہیں[**یہ احمقانہ رائے ھے قوموں کے عروج و زوال کا اس سے کوئی تعلق نھیں سائنس اندلس کو کیو ںنہ بچا سکی ایک بھی مسلمان وھاں کیوں نہ بچا. [یہ جاھل مطلق قوموں کے عروج و زوال کو توانائی کے ذرائع سے مشروط فرمارھے ھیں حضورؐ کے پاس قیصر و کسریٰ کے مقابلے میں توانائی کے کیا ذرائع تھے اندلس ھی میں تو بھت ذرائع تھے اندلس کیوں مٹ گیا ، مصری تھذیب ،فرعون، موھنجوڈرو ، یونانی تھذیب، چینی تھذیب ، جھاں بھت ذرائع تھے کیوں ختم ھوگئیں اگر طاقت ھی سب کچھ ھے اور توانائی کے ذرائع پر قبضہ ضروری ھے تو سلطنت روما کیسے عیسائی ھوگئی. ساحل]** ہماری تہذیب کے سارے اصول قرآن مجید سے ہی پھوٹتے ہیں۔ قرآن سے ہمارا تعلق تیسری چوتھی صدی میں ہی ختم ہوگیا ہے۔ توانائی کے برتر ذرائع کی دریافت یہی ہے جسے ہم آج سائنس و ٹیکنالوجی کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں سائنس اور ٹیکنالوجی کے بجائے فلسفے اور تصوف کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہمارے ہاں کلاسیکی شخصیات میں آخری شخصیت علامہ اقبال ہیں اور ان کی شاعری اور تصانیف میں تصوف غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں فلسفہ اور تصوف سائنس اور ٹیکنالوجی متبادل تو کیا ہوں صرف چارپائی پر لیٹنا سکھا سکتی ہے بدھ شو بنا سکتی ہے تپسیہ سکھا سکتی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نہ ہونے کی وجہ سے ہم زوال سے آشنا ہوئے ہمارے قائدین کو ان دونوں چیزوں کو ہدف بنانا چاہیے تھے [جاوید غامدی مطلقاً جاہل شخص ہیں انہیں جدید سائنس وٹکنالوجی کی حقیقت کا علم نہیں ہے اس سلسلے میں وہ صرف ہزرل کی کتاب Critique on uropean Sciences اور ہائیڈیگر کی کتاب Question Concerning Technology پڑھ لیں تو جدید سائنس کی حقیقت واضح ہو جائے گی جو غامدی صاحب کی نظر میں عہد حاضر کا خدا ہے اور جس کی پرستش ضروری ہے۔ اگر ہائیڈیگر کی کتاب سمجھنے میں دشواری

ہوتو درج ذیل کتابوں کا مطالعہ فرمائیں]

[1] Discourse on Method and the Meditations by Rene Descartes, translated by F. E. Sutcliffe [2] Crises of European Sciences by Edward Husserl. Mathematical Principles of Natural Philosophy.[3] Science A History, by John Gribbin. [4] Newton to Einstein by Ralph Baicelain. [5]A History of Science by William Dampier. [6] Galileo at Work by Stillman Drake [7] Issac Newton by Rupert Hall [8] Nicholas Copernicus by Josef Rednicbi. [9] The Scientific Work of Rene Descartes by J. F. Scott. [10] The Scientific Revolution by Steven Shapin. [11] Science and the Modern World by A. N. Whitehead [12] Foresight and understanding by Stephen Toulmin [13] Philosophy of Science by Alexendar Bird [14]What is this thing called science by A. F. Chalmer [15] Between Science and Metaphysics by S. Amsterdamski [16] Belief, Truth and Knowledge by D. M. Armstrong [17] Truth and Logic by A. J Ayer [18]Two Paradigms of Scientific Knowledge by D. Bloor [19] The Natural Philosophy of Galileo by Maurice Clavelin [20] Feyerabends Discourse against Method by J. Curfhoys and W. Suchting [21] On Scientific Method by J. J. Daires [22] How to defend Society against science by P. K. Fayerabend [23] Two New Sciences by Galileo Galilei [24] Philosophy of Natural Science by C. G. Hampel [25] Treatise on Human Nature by D. Hume. [26] Metaphysics and Measurement by A. Koyre [27] The structure of Scientific Revolution by T. Kohn. [28]Proofs and Refutation by Z. Lakatos [29] The logic of Scientific Discovery by Karl Popper. [30] Science and Subjectivity by Israel Scheffler

فرماتے ہیں امت کے اندران دونوں چیزوں کی نشوونما کی کوشش کرتے انھوں نے اس کا تجزیہ کیے بغیر ایک سادہ حل پیش کردیا ہم نے پہلے بھی جہاد سے دنیا کو فتح کیا تھا آئندہ بھی وہی طریقہ ہمارے لئے کارآمد ہوگا۔ یہی وہ چیز تھی جس نے تحریک مجاہدین کو وجود دیا یہی وہ چیز ہے جس نے جنگ آزادی میں مسلمانوں کو آمادہ قتال کیا۔ یہی وہ چیز ہے جس کا مظاہرہ آپ نے طالبان کے ہاں دیکھا عراق میں دیکھا اوراب مزید دیکھیں گے کئی جگہوں پر۔ قوموں کے برتری کے معاملات جن بنیادوں پر ہوتے ہیں ہماری مذہبی قیادت اس کے بارے میں ایک بالکل غلط رائے رکھتی ہے۔ امریکی عوام نے ایک دن میں فیصلہ نہیں کیا کہ چلو جہاد کرتے ہیں۔ یہ عوامل ان کے اندر پہلے پیدا ہوگئے پھرانھوں نے غلبہ حاصل کیا ہے۔ قرآن اورتمام صحیح احادیث میں یہ کہیں نہیں ہے کہ دنیا کا اختتام مسلمانوں کی حکمرانی پر ہوگا بلکہ بالکل اس کے برعکس نظریہ پیش کرتی ہیں۔ یافث کی نسل کے اقتدار پر دنیا کا خاتمہ ہوگا یہ قرآن شریف بتاتا ہے۔[**غامدی صاحب کے خیالات رینے گینوں کا سرقہ میں جس نے بتایا ھے کہ دنیا پر اب مغربی تھذیب غالب رھے گی اس سلسلے میں ساحل نومبر ۲۰۰۵ء کا شمارہ مطالعہ کیا جائے. غامدی صاحب یہ پیغام دے رھے ھیں کہ قرآن کی رو سے اب مسلمان قیامت تک استخلات فی الارض کے حق دار نھیں رھے یہ جھالت اور مغرب کی کاسہ لیسی کی آخری انتھا ھے کہ مغرب کا عروج قرآن حکیم سے ثابت کیا جائے، ساحل**]

سوال: قرآن میں ۵ مقامات پراللہ نے کہا ہے کہ یہود ونصاریٰ تمہارے کھلے دشمن ہیں ان سے دوستی نہ کرو؟

جواب: یہود ونصاریٰ کو بحیثیت قوم مخاطب نہیں کیا گیا یہ نبی کریم کے یہود ونصاریٰ تھے۔

ساحل مئی ۲۰۰۷ء

غامدی صاحب نہ عربی جانتے ہیں نہ مغربی فلسفہ سے واقف

ڈاکٹر رضوان ندوی کے چالیس نشان زد صفحات

غامدی صاحب کی عربی دانی کی حقیقت ساحل کے اپریل ۲۰۰۷ء کے شمارے میں ڈاکٹر رضوان ندوی صاحب کے مصمون نے کھول کر رکھ دی رہی سہی کسر زیر نظر شمارے میں ڈاکٹر رضوان ندوی کے خط میں ملاحظہ فرمایئے اور جاوید غامدی صاحب کے ادارہ المورد کی عربی ویب سائٹ کے چالیس صفحات سے جو کچھ برآمد ہوا ہے اس پر رضوان ندوی صاحب کے قلم سے جو تبصرے، تنقید، اعتراضات کئے گئے ہیں وہ بھی ملاحظہ کر لیجیے۔ عربی صفحات آئندہ شمارے میں شائع کیے جائیں گے جن پر ندوی صاحب کے تبصرے بھی ہیں اس کے ساتھ ندوی صاحب کا عربی زبان میں نقد اور اس نقد کا ترجمہ بھی شائع ہوگا، عربی زبان وادب میں اس جہالت کے باوجود ۱۹۷۵ء میں غامدی صاحب نے قرآن کے مقابلے پر چالیس آیات پیش کرنے کا دعویٰ بھی کیا۔ آیات بھی پڑھ لیجیے۔ المورد کے عربی صفحات اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ جاوید غامدی اور ان کے تمام شاگرد طالب محسن، سمیع مفتی، ساجد حمید، سلیم شہزاد وغیرہ وغیرہ عربی زبان سے نابلد، اجہل، کورے اور بے بہرہ ہیں لہٰذا انھیں نہ امور اسلامی پر رائے دینے کا حق ہے نہ اجتہاد کرنے کا نہ مفتی بن کر فتوے دینے کا یہ اجہل پہلے اپنی عربی درست کریں علوم اسلامی پر عبور حاصل کریں غامدی صاحب کی تقلید ترک کر کے اجماع کی تقلید کریں اس کے بعد ان کے مستقبل کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔ عربی کے ان علاماؤں نے آج تک عربی زبان میں کوئی رسالہ نہیں نکالا ۱۹۹۱ء میں غامدی صاحب نے الرائد کے نام سے عربی رسالے کے اجراء کا اعلان کیا تھا لیکن سولہ سال گزرنے کے باوجود اس رسالے کی اشاعت نہ ہو سکی جو ثبوت ہے اس کا کہ یہ حلقہ عربی میں کیسی عمدہ مہارت رکھتا ہے۔ جس زبان کے فتنی ہونے کا صور پوری دنیا میں پھونکا گیا تھا۔ اس زبان میں آج تک غامدی صاحب اور ان کا تمام حلقہ نہ کوئی کتاب لکھ سکا نہ عربی میں کوئی رسالہ نکال سکا۔ برعظیم پاک و ہند کے تمام مسلمہ مکاتب فکر کے اکابرین نے ہمیشہ عربی میں وقیع علمی کام پیش کیا، لیکن عربی زبان پر تکبّر کی حد تک اترانے والے امین احسن اصلاحی اور غامدی صاحب نے کبھی ایک کتاب تک عربی میں نہیں لکھی اس کے باوجود عربی دانی کے وہ وہ دعوے ہیں کہ انھیں پڑھ کر ہنسی آتی ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کچھ لوگ یقیناً اب بھی جاوید غامدی صاحب کے علم و فضل کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ چلو عربی نہیں آتی لیکن اس حلقے کے لوگ پڑھے لکھے روشن خیال ہیں اور غامدی صاحب وغیرہ کو انگریزی تو آتی ہے اس کے ثبوت میں عام طور پر لوگ جاوید غامدی صاحب کی کتاب ''مقامات'' کے آخری صفحات پیش کرتے ہیں جہاں ''چند انگریزی نظموں'' کے نام سے انگریزی میں غامدی صاحب کی چار نظمیں درج کی گئی ہیں آیئے ان جعلی نظموں کا بھی تحقیقی جائزہ پڑھیں یہ جائزہ ساحل کے اسی شمارے میں ملاحظہ فرمایئے اور ساتھ ہی ساتھ غامدی صاحب کی فلسفہ دانی کی حقیقت بھی تفصیل سے ملاحظہ کیجیے۔ بے چارے نہ سائنس کے بارے میں جانتے نہ مغرب کی دہشت گردی کے بارے میں یہ نام نہاد دانشور آج کل سب سے بڑے مفکر اسلام کہلاتے ہیں۔

ساحل مئی ۲۰۰۷ء

غامدی صاحب اوران کے لائق شاگردوں کی غلط سلط عربی

غامدی صاحب، طالب محسن اور سمیع مفتی کی عربی املاء غلط، انشاء غلط

ڈاکٹر رضوان علی ندوی

محترم مدیر ''ساحل'' السلام علیکم ورحمۃ اللہ

غامدی طالب محسن، سمیع مفتی کی عربی کچرا ہے:

ابھی میں جاوید احمد غامدی صاحب کی عربی زبان دانی کی حقیقت کھول کر فارغ ہی ہوا تھا کہ آپ نے دوبارہ غامدی صاحب اوران کے خاص الخاص لائق شاگردوں طالب محسن اور سمیع مفتی کی عربی تحریروں وتراجم کا ''کچرا'' بھی بھیج دیا کہ ان پر ایک نظر ڈالوں۔ ''حضرت الأستاذ الغامدی'' ہی کی عربی میں جب ''املاء، انشاء نحو اور لغت کی لاتعداد غلطیاں ہوں تو شاگردان گرامی کس گنتی میں ہوں گے۔ ''او خویشتن گم است کرا رہبری کند''۔

غامدی مکتب فکر کی عربی تحریریں کچرا کیوں ہیں؟

عربی کے یہ اوراق جو آپ نے غامدی صاحب کی ویب سائٹ http://arabic al_mawrid.org.2004 سے نقل کر کے مجھے بھیجے ہیں، ان کو میں نے کچرا کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں کیا ہے، ان میں املاء، نحو تذکیر وتانیث ولغت کی ایسی مسلسل غلطیاں ہیں جن کو دیکھ کر طبیعت مکدر ہوگئی اور جن کی نشان دہی اور تصحیح کرتے کرتے طبیعت بےزار ہوگئی، بہرحال یہ اوراق اپنی بعض تصحیحات کے ساتھ واپس کر رہا ہوں۔

ٹوٹی پھوٹی عربی کے ساتھ گمراہ افکار کی تبلیغ بھی:

نصف صدی تک عرب ممالک میں عربی زبان پڑھنے پڑھانے کے بعد اب میرا کام یہ تو نہیں رہ گیا ہے کہ میں ان نوآموز شاگردوں کی عربی ٹھیک کروں، بہرحال آپ کا شکریہ کہ آپ نے اس فتنہ کی طرف میری توجہ مبذول کرائی۔ مجھے غامدی صاحب اوران کی ''امت'' کی جسارت پر حیرت ہے، صحیح حدیث شریف ہے: اذا لم نسخ فاصنع ماشئت، جس کا فارسی میں مشہور ترجمہ ہے ''بے حیا باش وہر چہ خواہی کن''۔ ان لوگوں کو کچھ غیرت تو آنا چاہیے کہ اپنے ادارے کا ایک ایسا بھاری بھرکم، اگرچہ بیروت سے چرایا ہوا نام ''المورد'' رکھا ہے، لیکن اس سے ایسی ٹوٹی پھوٹی عربی میں اپنے ناپختہ بلکہ گمراہانہ افکار کی عربی زبان میں تبلیغ!

ایڈیٹر ساحل مطمئن رہیں، غامدی صاحب کی اس عربی ویب سائٹ سے عرب تو متاثر نہ ہوں گے بلکہ اس عربی کا مذاق ہی اڑائیں گے، البتہ پاکستان کے عربی مدارس کے بعض طلبہ جو کمپیوٹر پر بیٹھتے ہیں وہ اپنی کم علمی کی وجہ سے اس ''لنگڑی لولی'' عربی سے متاثر ہو جائیں گے، کیونکہ ان کے مدارس میں عربی تحریر کی بھرپور مشق کرائی ہی نہیں جاتی ہے۔

ساحل مئی ۲۰۰۷ء

عربی ویب سائٹ پر جعلی سوالات:

آپ نے جو اوراق ویب سائٹ سے نقل کر کے مجھے بھیجے ہیں ان میں سے بیشتر عربی زبان میں ہیں، جن میں کسی مستفسر نے کسی دینی مسئلے میں غامدی صاحب یا ان کے ادارے سے کوئی استفسار کیا ہے۔ یہ تمام مستفسرین پاکستانی ہیں، جن کے نام عبدالوحید خان، قدرۃ اللہ ماسٹر لال خاں، بشریٰ ناز انصاری وغیرہ دیئے ہوئے ہیں اور یہ سب استفسارات ۲۰۰۴ء میں کیے گئے ہیں۔ ۲۰۰۴ء سے لے کر ۲۰۰۷ء تک کسی نے عربی میں کوئی استفسار نہیں کیا۔ یہ حیرت انگیز بات ہے۔ سوال کرنے والوں میں کوئی عرب نہیں ہے۔ اب پتہ نہیں کہ استفسار کرنے والوں نے یہ استفسارات عربی زبان میں کیے تھے یا اردو میں؟ گمان غالب بلکہ یقین ہے کہ انھوں نے یہ سوالات اردو میں کیے ہوں گے جن کا ترجمہ جناب غامدی یا محمد سمیع مفتی یا طالب محسن نے عربی میں کیا ہے یا کرایا ہے، اس یقین کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ ان مرسلہ اوراق میں غامدی صاحب کی بعض طویل تحریروں کا ترجمہ بھی شامل ہے جن پر کاتب کا نام سمیع مفتی تحریر کیا گیا ہے۔

بھونڈی مہمل بے سروپا عربی

ان عربی تحریروں میں جو ادارۂ المورد کے بانی غامدی صاحب، کے قلم سے اور بعض تحریریں ادارے کے ''زمیل'' (Fellow) اور غامدی صاحب کے بہت ممتاز شاگرد طالب محسن صاحب اور سمیع مفتی کے قلم سے ہیں، ان میں املاء اور قواعد زبان کی جو اغلاط ہیں اور جن کی میں نے انہی عربی اوراق میں نشاندہی وتصحیح کر دی ہے اردو داں قارئین کے افادے کے لیے میں ان میں سے بعض یہاں ذکر کرتا ہوں۔

غامدی صاحب تذکیر وتانیث سے ناواقف:

عبدالوحید خاں کے استفسار ''رشّ الماء علی القبر'' [قبر پر پانی چھڑکنا] کے جواب میں جو طالب محسن صاحب کے قلم سے ہے، اس کا پہلا جملہ ہی بھونڈی اور مہمل عربی ہے، جس کی اصلاح اسی ورق پر کر دی گئی ہے، لیکن انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ طالب محسن صاحب [یا ان کے مترجم محمد سمیع مفتی یا ان کے سرپرست اور استاد غامدی صاحب] کو اتنا تو جاننا چاہیے تھا کہ جب انھوں نے جملے میں ''القبر'' کا لفظ استعمال کیا تھا تو دوسری سطر میں اس کے لیے ''المدفون فیه'' یعنی ضمیر مذکر ''فیه'' تو نہ لکھتے ''فیها'' لکھنا چاہیے تھا، یہ بات عربی زبان کے مبتدی بھی جانتے ہیں۔

پھر پانچویں سطر میں ''یامرنا لدعاء المغفرة'' کہاں کی عربی ہے؟ عربوں کی عربی میں تو یا مرنا بالدعاء للمغفرة کہا جائے گا، کیونکہ عربی زبان میں تو ''أمرته بکذا'' کہا جاتا ہے۔ ''لکذا'' تو نہیں۔ اس کے بعد کی سطر میں ''فانهّا عمل مستحب'' میں پھر تذکیر وتانیث کی بدیہی غلطی ہے، فانها تو مؤنث کے لیے ہوتا ہے، اور ''عمل'' تو مذکر ہے اس لیے ''فانه'' ہونا چاہیے تھا۔ حیرت ہے کہ اتنی ابتدائی عربی آتی نہیں اور غامدی صاحب اور ان کے نوآموز شاگرد المورد کی ویب سائٹ پر طالب محسن صاحب اور نہ جانے کس کس نام سے اردو اور عربی زبان میں فتویٰ دینے بیٹھے ہیں!

کیا قبر کا مردہ بھی نصیحت کر سکتا ہے؟

انہی عبدالوحید صاحب کے ایک اور سوال کے جواب میں جو بیوی کے قبر میں رکھنے کے بعد شوہر کے اس کا چہرہ دیکھنے سے متعلق ہے، اس کے چار سطری جواب میں طالب محسن صاحب فرماتے ہیں: ''لیس لهذا العمل وقتاً محدداً'' ..... کیا آپ کے ''حضرۃ الأستاذ الغامدی'' صاحب نے جنھوں نے عربی زبان ودینی علوم کے نصاب میں زمخشری کی ''المفصل'' اور ابن ہشام کی ''مغنی اللبیب'' جیسی اعلیٰ درجہ کی نحو کی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ آپ کو نحو کا یہ ابتدائی قاعدہ بھی نہیں بتایا کہ کوئی مجرور ''لیس'' کا اسم نہیں ہو سکتا، بلکہ ایسے جملے میں جو ''خبر'' ہوتی ہے، وہی اسم مقدر ''لیس'' کا ہوتا ہے، اس لیے صحیح جملہ ہے: ''لیس لهٰذا العمل وقت محدد'' آخری سطر میں ''التذکیر'' بھی غلط ہے، التذکر ہونا چاہیے کیونکہ تذکیر تو کوئی دوسرا کرتا ہے، قبر کا مردہ تو اب نصیحت دے نہیں سکتا، البتہ چہرہ دیکھنے والا اس سے کوئی نصیحت بلکہ صحیح تر یہ کہ ''عبرت'' حاصل کر سکتا ہے اور اس کے لیے عربی زبان میں لفظ ''اعتبار'' زیادہ مناسب ہے۔

المورد کی ویب سائٹ پر جعلی سوالات:

ایک اور سوال یا استفسار "رؤیة اللہ تعالیٰ فی المنام" [خواب میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو دیکھنا] سے متعلق ہے اور سائل نے مولانا عبدالحق محدث دہلوی کی کسی کتاب کے حوالے سے لکھا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو "ایک مرتبہ" اور امام ابوحنیفہؒ نے "سو بار سے زیادہ" خواب میں دیکھا، تو یہ رویت کہاں تک صحیح ہے؟ پہلی بات تو یہ کہ سوال جعلی معلوم ہوتا ہے، مولانا عبدالحق محدث دہلوی کی کتاب کا نام دینا ضروری تھا، پھر یہ کہ امام ابوحنیفہؒ کے متعلق عربی اور اردو میں دسیوں کتابیں تصنیف ہوئی ہیں، سائل کو ان کی کسی بھی سوانح حیات میں اس بات کو دیکھ کر پھر ایسا سوال کرنا چاہیے تھا۔ بہرحال جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے، تو تمام اہل سنت کے مکاتب فکر کا اس پر اتفاق ہے کہ رویت باری دنیا میں ناممکن ہے، چاہے خواب ہو یا حالت بیداری قرآن میں ہے: "لاتدرکہ الأبصار" [سورۃ الانعام:۱۰۳] البتہ آخرت میں اہل ایمان اللہ تعالیٰ کو دیکھ سکیں گے جس کا قرآن میں ذکر ہے: وجوہ یومئذ ناضرۃ o إلی ربھا ناظرۃ O [سورۃ القیامۃ:۲۲،۲۳]۔ کچھ چہرے اس دن شاداب و پررونق ہوں گے اور اپنے رب کو دیکھ رہے ہوں گے۔ صحیح احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ البتہ قدیم معتزلی فرقے کے لوگ اس رویت باری تعالیٰ کے بھی قائل نہیں تھے، ہوسکتا ہے کہ جدید معتزلی بھی ایسا ہی کہتے ہوں۔

غلط سلط بلکہ غلط در غلط عربی:

بہرحال مجھے فی الحال تو اس جواب کی عربی زبان کے بارے میں کچھ کہنا ہے، کہوں کیا؟ یہ جواب تو املاء، زبان اور نحو کی اغلاط سے پر ہے، جن کی نشاندہی اسی صفحہ پر کردی گئی ہے، یہاں عرض ہے کہ اس میں "انہ مستوی" غلط ہے، صحیح "مستوٍ" ہے "الأنصب" غلط ہے، صحیح الأنسب ہے، "رویة" غلط ہے، صحیح رؤیة ہے۔ اور "من صنع مخلیّہ" غلط ہے، صحیح من صنع مخیّلتہ ہے۔

میں کہاں تک آپ کے ارسال کردہ چالیس صفحات میں درج اغلاط کی نشان دہی اور تصحیح کروں، آپ المورد اور غامدی صاحب کے یہ عربی کے اوراق ایسے ہی چھاپ دیجیے۔ راقم نے اکثر جگہوں پر اغلاط کی تصحیح کردی ہے اور کہیں صرف غلطی کی نشان دہی کردی گئی ہے عربی پڑھنے والے خود ہی جان جائیں گے۔

المورد کی غلط سلط عربی پاکستان کی بدنامی ہے:

ویب سائٹ پر غامدی صاحب خود اور ان کی نگرانی و سرپرستی میں ان کے شاگردانِ رشید اس طرح کی غلط سلط عربی لکھ کر پاکستان کو بدنام کررہے ہیں، وہ عرب جو اس ویب سائٹ کو کھولیں گے اور اس عربی کو پڑھیں گے تو یقیناً ان کے لبوں پر ایک زہرخند ہوگا اور دل میں حقارت کے جذبات بہتر ہوگا کہ غامدی صاحب اور ان کے "چیلے" عربی زبان کو معاف کریں اور اپنے گمراہانہ خیالات کا اظہار اردو وہی میں کیا کریں۔

کیا غامدی صاحب نے عربی لکھنا ترک کردیا ہے؟

شاید غامدی صاحب نے خود اب عربی لکھنا چھوڑ دی ہے، اب وہ اپنے شاگردوں سے اپنی نگرانی میں عربی لکھواتے ہیں، استاد کی عربی ہی غلط سلط ہے تو شاگرد کی عربی کیسے اغلاط سے پاک ہوسکتی ہے۔ ان کے بعض طویل مضامین کا ترجمہ کسی محمد مسیح مفتی صاحب نے کیا ہے، معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ یہ صاحب سات آٹھ سال سعودی عرب رہ کر آئے ہیں۔ ان کی عربی میں وہ بوسیدگی اور فرسودگی اور تصنع تو نہیں جو غامدی صاحب کی عربی میں ہے اور جس کی تفصیل سے نشان دہی گزشتہ شمارے میں کی جاچکی ہے، لیکن ان نوجوان ونوآموز شاگرد کی نحو بڑی کمزور ہے، اور یہ عربی محاورے سے بےخبر ہیں۔ اس لیے بہت اغلاط کرتے ہیں۔

بہرحال ان صاحب کی عربی اور غامدی صاحب کے پیش کردہ افکار یا انحرافات پر آئندہ کچھ لکھوں گا۔ اس وقت اس پر اکتفا کرتا ہوں۔ [المورد عربی ویب سائٹ کی غلط سلط عربی کے چالیس عکسی صفحات آگے ملاحظہ کیجیے ان صفحات کا خط خفی کرکے صفحات کم کئے گئے ہیں۔ رضوان ندوی صاحب نے غامدی صاحب کے افکار پر عربی میں تیس صفحات پر مشتمل مضمون لکھا ہے جس میں عربی دانی کا جائزہ بھی شامل ہے۔ یہ مضمون اگلے شمارے میں ترجمے کے ساتھ ملاحظہ کیجیے، ساحل]